ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

مارچ ۲۰۲۰ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۹ | رجب ۱۴۴۱ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00 روپے
سالانہ: 250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00 روپے
بیرونی ممالک: 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 4000:00 روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation
Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	سماج کی تین بیماریاں	مولانا محمد اویس ندویؒ
۲-	اداریہ	ہمیں ہر حال میں غم کا یہ دریا پار کرنا ہے	مدیر	۳
۳-	خاص تحریر	تم اچھے مسیحا ہو دوا کیوں نہیں دیتے	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۷
۴-	مطالعات	خدا کا قانونِ جزاء	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن	۱۱
۵-	//	دستورِ ہند-ایک معروضی مطالعہ	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۱۶
۶-	تجزیہ و حل	موجودہ عالمی مسائل کا حل اور سیرت رسول ﷺ	سید احمد ومیض ندوی	۲۰
۷-	تعلیم و تربیت	پس وپیش میں مبتلا رہنا اور اپنے آپ پر اعتماد نہ کرنا	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۲۴
۸-	//	ماحول کے ڈر سے آنے والی تبدیلی عارضی ہوتی ہے	محمد قمر الزماں ندوی	۳۰
۹-	موجودہ منظر نامہ	یہ آزادی بچانے کی لڑائی ہے	ڈاکٹر محمد منظور عالم	۳۲
۱۰-	//	شہریت ترمیمی قانون؛ مسلمان کیا کریں؟	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۳۴
۱۱-	دعائیں	قنوتِ نازلہ اور دوسری دعائیں	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۳۸
۱۲-	اصلاح حیات	مومن مَرد اور مومن عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں	مولانا ندیم احمد انصاری	۴۵
۱۳-	تاریخ کے جھروکوں سے	مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۴۸
۱۴-	مذاہبیات	سکھ مت—ایک تعارف	مفتی تبریز عالم حلیمی قاسمی	۵۵
۱۵-	تعارف و تبصرہ	''آخرت کی تیاری اور اس کے محرکات وذرائع''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۶۰
۱۶-	//	''عظمت واعجاز قرآنی کے عجیب وغریب پہلو''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۶۱
۱۷-	گوشۂ ادب	دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی!	علامہ اقبالؒ	۶۴
۱۸-	درسِ حدیث	اپنے فرض منصبی سے علماء کی روگردانی	مولانا محمد سہیل ندوی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

ہمیں ہر حال میں غم کا یہ دریا پار کرنا ہے

دو ماہ مکمل ہونے کو ہیں، ملک کے طول وعرض پر حکومت مخالف احتجاجات کا سلسلہ جاری ہے، اہل جنوں حکومت کے ظالمانہ قانون اور NPR وNRC کی اسکیم کے خلاف مہم میں دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح کی قربانی دے رہے ہیں اور زبانِ حال سے اس عزم کا اظہار کر رہے ہیں کہ ؎

شکستہ دل کی کشتی ہو، کہ ہو طوفاں حوادث کا
ہمیں ہر حال میں غم کا یہ دریا پار کرنا ہے

اللہ کے قانون میں نصرت الٰہی مشروط ہے ایمان وعمل سے، جب انسان اللہ کی قدرت اس کے مطلق تصرف پر کامل اعتماد کے ساتھ اسباب کو اختیار کرتا ہے اور اپنے بس پھر جدوجہد کرتا ہے تو اللہ کی مدد بھی اترتی ہے، اس وقت اگر غور کیجئے تو مسلمانوں نے جدوجہد کے نام پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے، سوائے ان لوگوں کے جن کو اپنے مفادات عزیز ہیں یا جو ''وہن'' کا شکار ہیں یا مصلحت بے جا کے اسیر ہیں یا جن کے کرتوتوں کے سبب ان پر حکومتی شکنجہ سخت ہے اور وہ حکومتی پالیسیوں کی خفیہ وعلانیہ تائید پر مجبور ہیں، مسلمانوں نے اس وقت جس جرأت وعزیمت کا ثبوت دیا ہے اور جس پامردی و استقلال کے ساتھ ملک کی سب سے متشدد اور طاقت کے نشہ میں چور حکومت کا مقابلہ کیا ہے وہ بھارت کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ قوم کے اندر جذبہ بھی ہے، جرأت بھی ہے اور عمل کی صلاحیت بھی، یہ الگ بات ہے کہ اس کی غلط سمت میں رہنمائی کی گئی، اس کو میٹھی گولیاں اور تھپکیاں دے کر سلایا گیا، اس کو طفل تسلیاں دی گئیں، اس کو فرقہ پرستی کے بھوت سے ڈرا کر کانگریس کا غلام بنایا گیا اور کانگریس غلاموں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک بھی کرتی رہی، یہ الگ بات کہ کانگریس اشرافیہ کے پاؤں بھی چھوتی رہی، ہاتھ بھی چومتی رہی اور اشرافیہ کے گھرانے روز افزوں ترقی بھی کرتے رہے، مگر ساتھ ہی مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس پروان چڑھتا رہا، وہ تعصب، سوتیلے سلوک اور تشدد کو جھیلنے کے عادی بنتے رہے، ان کو دوسروں کے رحم وکرم پر جینے کی عادت پڑتی رہی، رفتہ رفتہ ان کے اندر یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ اس ملک میں ہم رہتے ہیں ہمارے لیے یہی کیا کم ہے، اس احساس کے ساتھ وہ ہر نوعیت کے ظلم کو سہنے کے عادی ہو گئے، جمہوریت کے تحفظ کے نام پر انھیں چوسا جاتا رہا اور ان ہی کے مال سے ظالم کے ہاتھ مضبوط کیے جاتے رہے، جبکہ ان ہی کوششوں کے درمیان نفرت کی خلیجیں بڑھتی رہیں، دشمن وار پروار کرتا رہا اور مسلمان غیر شعوری طور پر دوسرے درجہ کے شہری ہونے کے احساس میں

مبتلا ہوتے گئے، انھیں ہر قدم پر اس کا احساس ہوتا رہا کہ ہم مسلمان ہیں اس لیے ایسا سوتیلا سلوک ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے، اس لیے یہ دوہرا معیار اپنایا جا رہا ہے۔ وقت نے انگڑائی لی تو عین اس وقت جب بڑے بڑے لوگ اپنی بے بسی کا ماتم کر رہے تھے اور فرقہ پرستی کا خوفناک بھوت ان پر سوار تھا ایک ایسی تحریک شروع ہوگئی، جس نے خوف کے بادل چھانٹ دیے، ظلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اہل جنوں کھڑے ہوگئے، اپیل و لیٹر پیڈ کی قیادت کو کنارے کر دیا، ظلم و جبر کے عروج اور فرقہ پرستوں کے آگ اگلتے تیور ایک طرف لیکن حصول حق وانصاف کے لیے پرامن مظاہروں کی عملی جدو جہد ایک طرف، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان پہلی مرتبہ اس ملک میں برابری کا درجہ رکھنے اور یکساں اور اول درجہ کے شہری ہونے کے احساس سے سرشار ہوئے، پہلی مرتبہ انھوں نے احتجاج اور آزادی کا اصل لطف پایا، پہلی مرتبہ ان میں بنیادی حقوق کو چھین کر لینے کا جذبہ پیدا ہوا، ظالم نے پہلے مرحلہ میں مارِ استین کو آگے کیا مگر قوم سمجھ گئی، پھر ظلم وتشدد کی راہ اپنائی مگر تاریخ سے نابلد ظالم یہ بھول گیا کہ اسی ملک میں انگریز نے تشدد کی راہ اپنائی تھی تو اسے بھارت کے لوگوں نے ''ستیہ گرہ'' یعنی سچائی کے لیے پرامن مظاہرہ کے ذریعہ شکست دی تھی، تجزیہ نگاران جانتے ہیں کہ اس وقت حکومت پر کیا گذر رہی ہے، اس کی حلق میں ایک ہڈی پھنس گئی ہے جو نہ اگلتے بن رہی ہے نہ نگلتے بنتی ہے، اس قوم نے اس وقت قائدانہ کردار ادا کیا ہے، جس کے بارے میں دشمن نے سمجھ لیا تھا کہ اب ان میں جان باقی نہ رہی، اس سے نہ اپنے خوش ہیں نہ پرائے، دلتوں کی ایک بڑی تنظیم کے نمائندوں سے بات ہوئی تو انھوں نے صاف کہا کہ ان مظاہروں کو اب ختم ہو جانا چاہیے کیونکہ بی جے پی یہ باور کرانے میں کامیاب ہے کہ دلت مسلم الگ الگ ہیں اور اس تحریک کو صرف مسلمان چلا رہے ہیں، بین السطور مسلمانوں کے قائدانہ کردار پر ان کا درد جھلک رہا تھا، دوسری طرف اپنی روایتی قیادت ہے جو اب بھی کھل کر سامنے آنا تو دور ان اہل جنوں پر شفقت کا ہاتھ بھی نہ رکھ سکی ہے، البتہ موروثی قیادت کی حفاظت کے لیے پے در پے اقدامات ضرور کر رہی ہے، حالانکہ اس تحریک کا راست فائدہ یہ ہوا کہ بی جے پی کا جو خوف دلوں میں بیٹھا تھا وہ ہوا ہو گیا، بی جے پی نے گذشتہ ۶ رسالوں میں جو بیانیہ Narrative رائج کر دیا تھا کہ حکمراں جماعت یا حکومت کی پالیسیوں پر تنقید دیش دروہ اور ملک سے غداری کے مترادف ہے، موجودہ تحریک نے اس بیانیہ کو یکسر خارج کر دیا اور عیشلزم کا صحیح سبق پڑھایا، شیوسینا کے راجیہ سبھا ممبر سنجے راوت نے اپنے ایک ٹوئیٹ میں صاف کہا کہ ''آپ حکومت سے محبت کیے بغیر ایک سچے محبِّ وطن ہو سکتے ہیں''، چنانچہ اس وقت ملک کے عوام بلکہ بڑی حد تک میڈیا بھی تائب ہو کر جمہوریت کی مضبوط روایت ''مطالبہ اور محاکمہ'' پر عمل پیرا ہے، اس قوم کو اب تک جو کچھ نقصان ہوتا رہا اس کی وجہ تسلسل کے ساتھ دفاعی پالیسیاں اختیار کرنے، کچھ اپنے لوگوں کا کمیونل لہجہ استعمال کرنے، خوف و مصلحت کی چادر اوڑھنے اور تحفظات و احساس محرومی کی بار بار تلقین کرنے کے سبب ہوا، اس کو ذہنی طور پر پسماندہ اور غلام بنا کر چھوڑ دیا گیا، اسے ماتم و نوحہ اور گداگدی کے آگے کوئی سبق ہی نہ پڑھایا گیا لیکن اس موقع پر جنوں نے عقل کو مات دی اور بے خطر میدان میں کود پڑا اور یہ پیغام دیا کہ ؎

شبِ سیاہ کے ماتم سے کچھ نہیں حاصل
جو بن سکو تو بنو ماہِ ضوفگن کی طرح

اس وقت سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ قوم کے اندر جو خود اعتمادی اور آزادی کا احساس پیدا ہوا ہے اس احساس کی پرورش کی جائے، اسے پروان چڑھایا جائے، اس کو کسی بھی قیمت پر ماند نہ پڑنے دیا جائے، روایت سے اوپر اٹھ کر مستقبل کی فکر کی جائے، یاد رکھیے اس وقت قوم جس جگہ کھڑی ہے وہاں سے پیچھے ہٹنے کا مطلب ہلاکت و بربادی ہے اور آگے بڑھنے میں شہادت یا کامیابی ہے، کامیابی کے کئی امکانات ظاہر ہیں اگرچہ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں سوائے یہ عرض کرنے کے کہ ؎

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

البتہ یہ سوچنا از حد ضروری ہے کہ اگر یہ تحریک بے نتیجہ ختم ہوئی یا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی، یا منفی نتیجہ پر منتج ہوئی تو مسلمانوں کو بڑے نقصان کا سامنا ہوگا، اب تک صرف ایک رخ پر محنت ہو رہی ہے، ڈائیلاگ کی راہ نہیں نکالی جا رہی ہے، اپوزیشن پارٹیز سے بھی بات چیت نہیں ہو رہی ہے اور بغیر اس کے محض سڑک کی لڑائی سے مثبت نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں، اس ضمن میں تین باتیں قابل غور ہیں، پہلی یہ کہ اس تحریک میں لیفٹ کا عملی کردار نمایاں ہے، اور لیفٹ کسی طرح کی گفت و شنید کے لیے تیار نہیں، اس کے لیڈراں اپنی جان توڑ محنت سے مسلمانوں کے سہارے پورے ملک میں اپنی نشأۃ ثانیہ کے لیے موقع غنیمت سمجھ کر کوشاں ہیں، دوسری بات مسلم نوجوان کو روایتی قیادت قبول نہیں اور وہ اپنی متحدہ قیادت کی تشکیل میں یکسر ناکام ہے، احتجاج میں مختلف گروپوں کی شمولیت اور قیادت کا فقدان اس تحریک کو کسی مثبت نتیجہ پر لے جانے سے مانع ہے، تیسری بات یہ کہ راہ ہم کو ہی بنانا ہے، حکومت ہم سے بات کرنے کے لیے کبھی اقدام نہیں کرے گی کیونکہ وہ صاف کہتی ہے کہ مسلمانوں کی ہمیں ضرورت نہیں، ہمیں ان کا ووٹ نہیں چاہیے اور ہم دیتے بھی نہیں، پھر حکومت جانتی ہے کہ اس کی ہلکی سی بھی لچک خود اس کے ووٹ بینک کو بھی بکھیر دے گی، یہی وجہ ہے کہ وہ معاملہ کو طول دے رہی ہے تاکہ طوالت کے سبب خود ٹوٹ پھوٹ کر معاملہ خراب ہو جائے، یہ الگ بات کہ الحمد للہ اب بھی معاملہ پورے قابو میں ہے، البتہ دانشمندی اس میں ہے کہ ہم خود کوئی راہ تلاش لیں، حکومت کچھ نہیں کرے گی ہاں مجھے اس کا یقین ہے کہ اسے جو بھی فیصلہ لینا ہوگا وہ اپنی عدالتوں کے ذریعہ لے گی۔

یہ بھی قدرت کا احسان ہے کہ جب فرقہ پرستی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور ذرائع ابلاغ فرقہ پرستی کے پرچارک اور مسلمانوں کے دشمن ہو گئے تھے تو یہ ایک ایسی مہم شروع ہوگئی جس میں میڈیا کو بھی اپنا گندا چہرہ نظر آ گیا، کئی صحافیوں اور اینکروں کو اپنی شناخت کے خلاف بولتے اور سچ بولتے اور سچائی کو نقل کرتے دیکھا گیا، یہ بھی کرشمہ ہی ہے قدرت کا کہ عین اس تحریک کے دوران دہلی کا الیکشن ہوا، جس میں صاف نظر آیا کہ ہندو اور ہندوتوا آپس میں ٹکرا رہے ہیں، ہندتوا کے علمبردار زہر افشانی کرتے رہے اور ہندو ''کام کی سیاست'' کرتے رہے، نتیجہ آیا تو میں نے لکھا کہ ''دہلی الیکشن کے دوران صاف نظر آیا کہ ہندو اور ہندتوا ٹکرا رہے ہیں، رام و ہنومان کے پجاری باہم گتھم گتھا ہیں، بالآخر ہندو اپنے کام کی بنیاد پر جیت گئے اور ہندتوا شکست کھا گیا، مسلمانوں کے لیے اس ملک میں آگے بڑھنے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے تک ضروری ہے کہ ہندو

جیتے مگر ہند تو اشکست کھاتا رہے''، حکومت مخالف اس تحریک اور بی جے پی کی مسلم مخالف انتخابی تشہیری مہم کے باوجود دہلی الیکشن کے نتائج ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ اگر ہماری قیادت صحیح ہو، متحد ہو، صحیح منصوبہ بندی کرے تو اس ملک میں ابھی بھی ہندتوا کو شکست فاش خود ہندوؤں کے ذریعہ دی جاسکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو تحسبهم جميعاً و قلوبهم شتى اور ہم اپنی فراست سے اس حقیقت کو صورت حال پر منطبق کرنے کے اہل بن سکیں۔

قصہ مختصر اس وقت کی ترجیحات یہ ہیں کہ سیکولرزم اور کمیونلزم کی سیاست کو پسِ پشت ڈال کر دہلی کی سیاست سے پیدا ہوئی، جدید اصطلاح و سیاست کو فروغ دیا جائے اور ہر صوبہ کے الیکشن کو اسی جانب موڑ دیا جائے، سردست موجودہ تحریک کی کامیابی کے لیے ہر ممکن تگ و دو کی جائے اور NPR کے عمل کو روکنے کے لیے جو کچھ بن پڑے وہ کیا جائے، ورنہ کم از کم بائیکاٹ کی تشہیر کے لیے گاؤں گاؤں تشہیری و بیداری مہم چلائی جائے، ساتھ ہی اس کی کوشش کی جائے کہ احساس و بیداری کی جو نعمت اس وقت میسر آئی ہے اس کو سنبھال کر رکھا جائے اور پھر سے وہ تاریخی غلطیاں نہ دوہرائی جائیں جو ۱۹۴۷ء سے مسلسل اس ملک میں کی جاتی رہی ہیں، یہاں ایک اور اہم مسئلہ کا ذکر ضروری ہے تاکہ ہم سب اپنا تجزیہ کرسکیں اور مستقبل میں اس جانب توجہ دے سکیں، حالیہ احتجاجی مظاہروں میں ہر طرح کے لوگ شریک ہوئے، دیکھا گیا کہ بعض مقامات پر مسلمان آسانی کے ساتھ شرکیہ اعمال میں شریک ہوگئے، شرکیہ نعروں میں شریک ہوئے، اسلامی اقدار کے مخالف و معارض اقدار بھی اپنا لیے، اس سے واضح ہوگیا مذہبی تنظیموں اور جماعتوں کی کثرت، مدارس کی بڑی تعداد کے باوجود ہم ہنوز عوام کی فکری اور دینی تربیت کا حق نہ ادا کرسکے، عوام اور اہل دین کے درمیان خلیج ہے، اور اس خلیج کی بڑی وجہ ہماری محدودیت یا یوں کہیے کہ افراط و تفریط ہے، ہمارے یہاں ایسے مجتہد پیدا ہوجاتے ہیں جو حدود پھلانگنے کو ہی اجتہاد سمجھتے ہیں یا ایسے جمود کے داعی نکل آتے ہیں جو از خود اسلام کے حسین و پرکشش چہرے پر پردہ ڈالنے کا سبب بن جاتے ہیں، جمود و تشدد ہمیشہ مخالفت، عناد اور دوری کا سبب بنتا ہے، اسلام کے مزاج میں تیسیر اور توازن و اعتدال ہے اور یہی چیز اس کو فطرت سے ہم آہنگ کرتی ہے اور لوگوں کے لیے باعث کشش بناتی ہے، اسی اعتدال کے ساتھ ہمیں اس ملک میں کام کرنا ہوگا اور لوگوں کو بتانا ہوگا کہ سیکولرزم کے تحفظ کے لیے اس تحریک کو ہم سیکولر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم شریعت کے معارض کسی قدر و روایت کو اپنائیں، لوگوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ سیکولرزم کی روح یہ ہے کہ ہر شخص اپنی پسند کے مذہب اور اپنے اقدار و روایات کو اختیار کرنے میں آزاد ہے، اگر اس کے خلاف بات ہو تو پھر وہ سیکولرزم نہیں بلکہ استبداد و جبر کہلائے گا۔

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

❑ خاص تحریر

تم اچھے مسیحا ہو دوا کیوں نہیں دیتے

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

اکیسویں صدی میں ظالم اور جابر حکومتوں کے خلاف تیز و تند آندھی کی طرح تحریکیں اٹھیں جن سے حکومتوں کے خیمے اکھڑ گئے، بہت پہلے ایران میں اور پھر بعد میں عرب ملکوں میں، تیونس میں، مصر میں، شام میں، لیبیا میں عوام وخواص جابر حکومتوں کے خلاف انقلاب بردوش بن کر اٹھے اور انہوں زمین میں زلزلہ ڈال دیا اور حکومتوں کا تختہ الٹ دیا، کہیں یہ انقلاب کامیاب ہوا اور کہیں دنیا کی بڑی طاقتوں کی سازش سے اور خلیجی ملکوں کی کوشش سے ناکام ہوگیا۔ جو منظر عرب ممالک میں چند سال پہلے دیکھنے میں آیا تھا وہی منظر اب ہندوستان میں دیکھنے میں آرہا ہے۔ مصر کے میدان التحریر کی طرح ہندوستان کا ہر میدان میدان تحریر بن گیا ہے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں پرجوش احتجاجات کی لہر اٹھ رہی ہے، عصری جامعات کے طلبہ اور خواتین کا اس میں قائدانہ رول ہے، ان کے پیدا کردہ زلزلہ سے زمین ہل رہی ہے اور ان کے غلغلہ سے گنبد مینا گونج رہا ہے۔ حدیث نبوی کی روشنی میں انسان کو نہ تو ظالم ہونا چاہئے اور نہ مظلوم، ظلم کا مقابلہ کرنا ایک دینی قدر ہے اور جو نوجوان حکومت کے ظلم کو روکنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں وہ قابل قدر ہیں اور ان کی ہمت کی داد دینی چاہئے کہ سخت سردی کے موسم میں، برفبار ہواؤں میں، تمام برادران وطن کے ساتھ مل کر ہندوستان کے سیکولر اور جمہوری آئین کی حفاظت کے لئے اور تکثیری سماج کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر اس وقت مزاحمت نہ کی گئی تو اس ملک میں اقلیتوں کو لوح ایام سے مٹا دیا جائے گا۔ پھر نہ مسجدیں رہیں گی نہ چرچ نہ اقلیتوں کی عبادت گاہیں اور نہ مدرسوں کا وجود باقی رہے گا۔ موب لینچنگ، جے شری رام کے نعرے، سوریہ نمسکار، تین طلاق کا قانون، دفعہ ۳۷۰ کی منسوخی، بابری مسجد اور اب شہریت کے قانون میں ترمیم کا ایکٹ آیا ہے جس سے تمام اقلیتوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے، یہ سلسلہ دراز سے دراز تک ہوتا جارہا ہے، اگر ظلم کے خلاف پوری طاقت سے عوام نہیں کھڑے ہوں گے تو اس ملک کو اسپین اور ہندورا شٹر بنانے کا آر اس اس کا خواب پورا ہوجائے گا۔ اس تحریک احتجاج میں تمام مذہب وملت کے لوگوں ساتھ لینا بے حد ضروری ہے۔ تاکہ یہ تحریک طاقتور ہو، گوہر مقصود حاصل ہو اور یہ سفینہ ساحل مراد تک پہنچ سکے۔ ایک مقولہ یا نعرہ ہے جو مصر کی آزادی کی تحریک میں عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کو ساتھ لینے کے لئے وہاں کے مقبول اور ہر دلعزیز لیڈر سعد زغلول نے لگایا تھا الدین للہ والوطن للجمیع یعنی دین اللہ کا ہے اور وطن سب کا ہے۔ یہ نعرہ اس مفہوم میں تو غلط ہے کہ دین کا سیاست سے اور ملک کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس مفہوم میں درست ہے کہ دین اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کا نام ہے اور حقوق وطنیت میں جو لوگ شریک ہیں ان کے مشترک فائدے کے لئے وطن کی حفاظت کے لئے باہمی اشتراک وتعاون سے کام کیا

جانا وطن کا تقاضا ہے اور یہ دین کے خلاف نہیں۔

ہندوستان میں خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زمانہ میں جس طرح ہر ملت و مذہب کے لوگ شانہ بشانہ شریک تھے، اسی طرح موجودہ احتجاجات کے مدوجزر اور تلاطم میں ہر مذہب کے لوگ شریک ہیں اور ان احتجاجات کی باہمی اصل قوت اسی اتحاد و اتفاق میں پنہاں ہے وہ حکومت جو فرقہ ورانہ خطوط پر ملک کو تقسیم کرنا چاہتی ہے اس احتجاج کو بھی صرف مسلمانوں کا احتجاج ثابت کرنا چاہتی ہے اور کہتی ہے کہ ''کون احتجاج کر رہا ہے اس کا پتہ احتجاج کرنے والوں کے کپڑوں سے لگایا جاسکتا ہے۔'' دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ فرقہ ورانہ خطوط پر اس تحریک کو ہرگز نہ چلایا جائے اس میں تمام انصاف پسند اور سیکولر ذہن کے لوگوں کو اپنا ہم نوا اور ہم سفر ہمساز اور ہم آواز بنایا جائے ایسے نعروں سے گریز کیا جائے جن سے یہ شبہ ہو کہ یہ صرف مسلمانوں کا احتجاج ہے اور صرف مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ جو نوجوان طلبہ خالص مذہبی نعرے لگائیں گے وہ برادران وطن کو نفسیاتی اور ذہنی طور پر دور کریں گے اور اس حکومت کو طاقت بخشیں گے جو یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ'' شہریت کے ان قوانین کی مخالفت صرف مسلمانوں کی طرف سے ہو رہی ہے اور مسلمان شروع سے دیش ورودھی رہے ہیں'' سیرت طیبہ میں مسلمانوں کو حلف الفضول سے آسانی سے دلیل مل سکتی ہے، جب رسول اکرم نے نبوت سے پہلے اس معاہدہ میں شرکت کی تھے جو ظلم اور حق تلفی کے خلاف طے پایا تھا اور جس میں مختلف قبائل عرب نے شرکت کی تھی۔ مسلمانوں کا موجودہ احتجاج اسی مبارک معاہدہ کی طرح ہونا چاہئے جو ہر ظلم و قہرمانی اور ناانصافی کے خلاف تھا جس میں رسول اکرم ﷺ نے نبوت ملنے سے پہلے تمام قبائل عرب کے ساتھ شرکت کی تھی اور نبوت ملنے کے بعد فرمایا تھا کہ اس طرح کے کسی معاہدہ کے لئے مجھے بلایا جائے گا تو اب بھی میں اس میں شریک ہوں گا۔

اس کے باوجود کہ ظلم کی مخالفت مذہبی قدر ہے اور دین اسلام نے ظالم کا ہاتھ پکڑنے کا حکم دیا ہے لیکن اگر مسلمانوں نے احتجاجات کو یہ رنگ دیا کہ یہ ان کا اپنا مذہبی معاملہ ہے اور صرف ان کی شہریت کو خطرہ ہے، تو وہ دوسرے اپنے ہم وطنوں کو اس تحریک سے الگ کردیں گے اور نتیجہ کے اعتبار سے یہ تحریک ناکام ہوجائے گی۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اور تکثیری سماج میں آخر وہ وطنی تحریک کیسے کامیاب ہوسکتی ہے جو صرف ایک گروہ اور صرف ایک مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے برپا کی گئی ہو جس کا ساتھ دوسرے ہم وطن نہ دے رہے ہوں اور وہ اس کے ہم نفس اور ہم نوا نہ ہوں جبکہ حکومت بھی مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی دشمن ہو۔ اس وقت بعض بی جے پی کی حکومتوں نے احتجاجیوں کے خلاف سخت گیری شروع کردی ہے اور کہیں کہیں خرمن احتجاج پر حکومت کی بجلی بھی گری ہے چونکہ الکشن ابھی دور ہے اس لئے حکومت کو اطمنان حاصل ہے۔ ڈر یہ ہے کہ حکومت کی نامہربانی اور ناترسی اور ترہیب کی وجہ سے یہ مرغ بلند بام کہیں زیر دام نہ آجائے۔ اس وقت برادران وطن اور ان کے سماجی اور سیاسی لیڈر شیر وشکر ہوکر جمہوریت اور آئین کی حفاظت کے لئے احتجاج کی تحریک کا پورا ساتھ دے رہے ہیں یہ بہت خوش آئند بات ہے اور بہت مسرت افزا ہے۔ کوئی ایسی غلطی مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہونی چاہئے جس کی وجہ سے وہ ساتھ چھوڑ دیں اور مسلمان تنہا رہ جائیں۔ پھر اس اس احتجاج کی حیثیت ایسے دریا کے تلاطم کی ہوجائے گی جس کی تہ میں موتی نہ ہوں، وہ صرف ایسی آوازوں کا شور ہوگا جو معانی کی قوت سے تہی ہوں، وہ ایسی کشتی ہوگی جس کی قسمت میں ساحل نہ ہوگا، وہ ایسی صدا ہوگی جو صدا بصحراء کے مصداق ہوگی، وہ ایسی آواز ہوگی جو دور افتادہ ہوگی ''فغان قافلہ بے نوا کی قیمت کیا''۔

احتجاج، جلوس، مظاہرے اور مطالبے جمہوریت کے دور کے ضروری ہتھیار ہیں اور ان سے مفر نہیں لیکن یہ احتجاج پامردی اور استقلال کے ساتھ کب تک جاری رہ سکے گا یہ بہت اہم

سوال ہے۔، نگاہ دور بیں و دوررس کو حاضر الوقت مسائل کا پائدار حل بھی ڈھونڈنا چاہئے۔ جاری احتجاجات کی حیثیت وقتی اور عارضی علاج کی ہے یہ ضروری کام ہے لیکن ہمیں شفائے عاجل ہی پر نہیں شفائے کامل اور شفائے مستقل پر بھی توجہ دینی چاہئے اس کے لئے مرض کے اصل سبب کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حکومت ظلم کررہی ہے اور ظلم اس لئے کررہی ہے کہ اس کو پارلیامنٹ میں غیر معمولی عددی قوت حاصل ہے، یہ قوت اسلئے حاصل ہے کہ عوام نے اس کو ووٹ دیا ہے، عوام نے اس لئے حکمراں جماعت کو ووٹ دیا ہے کہ عوام کی اکثریت کے جسم میں اسلام اور مسلم دشمنی کے زہر کا انجکشن دیا گیا ہے، اس لئے برادران وطن کے ذہن سے جب تک اسلام دشمنی کا زہر نہیں نکالا جائے گا حالات نہیں بدلیں گے اور ہر تھوڑے دنوں پر ایک نیا زخم لگتا رہے گا۔ مسلمان ایک ہزار سال سے ہندوؤں کے ساتھ رہ رہے ہیں لیکن وہی بیگانگی اور غیریت جو پہلے تھی وہ اب بھی باقی ہے۔ اس لئے سب سے ضروری کام اور تمام کاموں پر مقدم کام برادران وطن سے رابطہ قائم کرنا ہے، ہر ایک سے باہمی تعارف اور شناسائی پیدا کرنا اور اپنے کردار اور اخلاق سے ان پر اچھا اثر ڈالنا ہے۔ یہی چیز حفاظت اسلام اور اشاعت اسلام کی ضامن ہوسکتی ہے۔ مسلمانوں کی بہت سی تنظیمیں ہے اور ان سب کا دائرہ کار صرف مسلمانوں کے درمیان ہے اس لئے اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسی نئی بڑی تنظیم کا قیام ہے جو برادران وطن کے درمیان کام کرے اور ان کے دلوں کو جیتنے کی کوشش کرے، نفرت سے بھرے لوگوں کے پاس محبت کا جام لے کر آئے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے رفاہ عام اور خدمت خلق کے عنوان سے ایک نئی تنظیم کو بروئے کار لانا ہوگا یا مسلمانوں کی موجودہ تنظیمیں جو اپنی جگہ مفید کام انجام دے رہی ہیں ان کو اس نئی مہم کو بھی سر کرنے کے لئے تیار ہنا پڑے گا اور اپنے یہاں اس ضروری کام کا ایک متحرک اور فعال شعبہ قائم کرنا ہوگا اور سماجی خدمت کے میدان میں آنا پڑیگا۔ یہ بات علماء دین کے پیش نظر رہنی چاہئے کہ امت مسلمہ کو ''خیر امت'' کا جو تمغہ امتیاز رب العالمین کی طرف سے مرحمت فرمایا گیا تھا وہ ''اخرجت للناس'' کے مشن کے لئے تھا جسے غلطی سے ''اخرجت للمسلمین'' کا مرادف سمجھ لیا گیا ہے۔ یاد رکھئے کہ اس اہم کام کی طرف سے بے التفاتی کے عواقب خطرناک ہوسکتے ہیں، یہ ضروری دینی کام مرد بیمار کے لئے داروئے شفا کی حیثیت رکھتا ہے اور اب ہر قیمت پر یہ کام انجام دیا جانا چاہئے ''اس بے حد ضروری کام کے لئے جو اس بیمار ملت کے لئے آکسیجن کی حیثیت رکھتا ہے اہل خیر اور اہل توفیق کو آگے آنا چاہئے۔ 'توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے۔''

ایک اور دوسرا ضروری کام ہے جو حالات کو بدلنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ بات ''خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں''۔ ہندوستان کی تاریخ میں اہل دل اور اصحاب روحانیت نے غیر مسلم عوام اور خواص پر بہت اثر ڈالا تھا ان کی خانقاہیں ستم رسیدہ انسانوں کی پناہ گاہیں تھیں، ان کی شفقت اور دلداری کی شبنم ان کے زخمی دلوں کے لئے مرہم تھی، مضطرب اور بے چین دلوں کو وہاں سکون اور آرام ملتا تھا، خلائق کا اور تمام مذاہب کے لوگوں کا ان پر اس طرح ہجوم ہوتا تھا جیسا پروانوں کا شمع پر ہوتا ہے۔ برادران وطن بہت بڑی تعداد میں ان سے معتقدانہ تعلق رکھتے تھے اور کچھ لوگ اسلام بھی قبول کرتے تھے۔ لیکن اب ''آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند'' وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر میں ایسے فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرنے والے زہد وعبادت کے پیکر موجود ہوں جو ارشاد وتربیت کا کام انجام دیں جو تمام مسلکی اختلافات سے بلند ہوں۔ ایسی روشن شمعیں جب جب جلیں گی پروانے بھی آئیں گے۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت کو ختم کرنے کے لئے اعلی روحانی استعداد رکھنے والے ایمان ویقین اور درد ومحبت کی مشعل جلانے والوں کی ضرورت ہے۔ تاریخ میں درویشانہ زندگی اختیار کرنے والے اولیاء کرام نے رواداری اور ہم

آہنگی پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور اس کے ساتھ پشت پر حکومت کی طاقت سونے پر سہاگہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب حکومت کی طاقت تو نہیں ہے مسلمانوں کی حکومت دوبارہ قائم نہیں ہوسکتی، اور نہ ان کا پرانا اوج اقبال واپس آسکتا ہے لیکن اگر مسلمان تعلیم میں اور اقتصادیات میں کوئی مقام پیدا کرلیں تو یہ انقلاب انگیز قوت حکومتی طاقت کا بدل بن سکتی ہے اور ان کی وجاہت کی بازیابی کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔ضروری ہے کہ ہر مسلمان کوئی حرفت اور ہنر سیکھ لے اور کوئی مسلمان گداگر باقی نہ رہے، مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو مسلمانوں کی تعلیم، صنعت اور اقتصادی حالت کے استحکام کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نے مسلمانوں کے امپاورمنٹ پر پورا لٹریچر تیار کردیا ہے جس سے سب کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔

تیسرا ضروری کام جو مسلم قائدین کے ذمہ قرض ہے وہ تمام بڑے شہروں میں جامعات میں عصری تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے اسلامی ہوسٹل کی تعمیر ہے جہاں ان کی ذہنی اور فکری اور اخلاقی تربیت کا انتظام ہوسکے۔ چوتھا ضروری کام دینی مذہبی مدرسوں میں نصاب تعلیم کی اصلاح ہے یعنی ایسا نصاب تعلیم ہو جسے پڑھ کر اور مدرسوں سے فارغ ہوکر علماء برادران وطن کو ان کی زبان میں مخاطب کرنے کے اہل ہوسکیں اور ان سے ڈائلاگ کرسکیں، قرآن کی اس آیت کو سامنے رکھنا چاہئے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر زمانہ کا پیغمبر اپنی قوم سے لسان قوم میں خطاب کرتا تھا۔ لسان قوم میں مہارت تو بڑی چیز ہے اب مسلمان اردو زبان سے بھی جو مادری زبان ہے غافل ہوتے جارہے ہیں، نئی نسل اردو نہیں سیکھ رہی ہے۔ اردو زبان میں ہماری مذہب اور ثقافت کا بہت بڑا سرمایہ ہے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ یہ سرمایہ ضائع ہوجائے گا۔ اردو زبان اہل اردو سے شکوہ سنج ہے اور ان کی بے غیرتی اور بے حمیتی پر ماتم کناں ہے۔ یہ کام اہل دانش وبینش اور علماء کرام کا ہے جن کی حیثیت مسیحائے قوم کی ہے کہ مذکورہ بالا خطوط پر امت کی رہبری کریں اور اپنی تقریر وتحریر سے ان کے اندر قوت عمل پیدا کریں اور انہیں بتائیں کہ اب وقت آگیا ہے کہ تعمیر اور تعلیم کے کاموں کے لئے اپنی ساری توانائیاں خرچ کرڈالی جائیں، جنگی خطوط پر کام کیا جائے اور وقت کے تلوں سے سارا تیل نچوڑ لیا جائے اور فضول خرچی کا کوئی کام نہ کیا جائے اور اپنا سرمایہ ملت کے کام پر لگایا جائے۔ انہیں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ ان کا مقابلہ ایسی تنظیم (آر اس اس) سے ہے جس کے پاس عسکری قوت اسقدر ہے جس قدر حکومت کے پاس ہے اور پھر اس وقت حکومت بھی اسی کی ہے، وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اسی کا ہے سارے وزراء اسی کے چشم وابرو کو دیکھ کر کام کرتے ہیں اور وہ اس کے آگے جواب دہ ہیں۔ اس تنظیم کے پاس ملک میں سیکڑوں اسکول اور کالج ہیں، وہ دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ تنظیم ہے اور اس کا نصب العین ہندو اسٹیٹ کو وجود میں لانا ہے۔ گذشتہ پچاس سال میں اس نے اتنی ترقی کی ہے کہ ملک کی اکثریت کے نزدیک وہ میر کارواں ہے اور مسلمانوں کی ترقی معکوس اس قدر ہے کہ وہ گرد کارواں بھی نہیں ہیں۔ کیا یہ باتیں غور وفکر کی دعوت نہیں دیتی ہیں۔ ہمیں غور کرنا ہے کہ اب ہمیں اب کیا کام کرنا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ''دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است'' لیکن ایمان کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔

اس مختصر تحریر میں پورا لائحہ عمل تجویز کردیا گیا ہے۔ ملت اسلامیہ کے مرد بیمار کے لئے چار اجزاء پر مشتمل یہ ایک تیر بہدف نسخہ کیمیاء اور داروئے شفا ہے۔ دیکھنا ہے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد میں کون ان کاموں کے لئے اور تمام خطرات کے سد باب کے لئے آگے آتا ہے۔ ہاتف غیب منتظر ہے کہ دیکھے کون ایسا مسلم قائد میدان میں آتا ہے جو ان افکار کو اور اس طویل مدتی منصوبہ کو عملی جامہ پہنائے اور یہ لکھے کہ اب مسلمانوں کے صحیفہ تاریخ کا ورق الٹنے والا ہے اور عزت وکامرانی کا دور شروع ہونے والا ہے ہر شخص کو انتظار ہے۔ ''مرد ے از غیب بروں آید وکارے بکند''

☆☆☆

❑ مطالعات

خدا کا قانونِ جزاء

(قرآن و بائبل کے مطالعہ کی روشنی میں)

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی
شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
Mob:-9058532670

یہ تو ہم کو معلوم ہے کہ اللہ کا ایک نظام ہے جس کو نظامِ ہدایت کہتے ہیں اور پھر اسی نظام کے تحت اپنے نبیوں کے ذریعہ سے ہر امت کی ہدایت کرتا ہے، قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ [1]

[اور ہم نے ہر امت میں ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور باطل معبودوں سے بچے رہو]

دوسری جگہ پر ارشاد ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ [2]

[یقیناً ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں]

تیسری جگہ ارشادِ ربانی ہے:

إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ [3]

[اے رسول ﷺ آپ عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے ہیں اور (اسی طرح) ہر قوم کیلئے ہادی یا رہبر ہے]

انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں تعلیماتِ الٰہی اپنی امتوں تک پہونچاتے رہے ہیں، اگرچہ انبیاء کی تعلیمات میں سطحی و فروعی اختلافات نظر آئیں گے۔ لیکن غور و خوض کے بعد پتہ چلے گا کہ سب کی تعلیمات کی اصل اور روح ایک ہی ہوگی کیونکہ سارے انبیاء ایک ہی قانونِ خداوندی کے تحت آئے ہیں۔ قرآن بھی اس کی شہادت دیتا ہے: سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا [4]

[آپ ﷺ سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے ان سب کا یہی طریقہ رہا ہے اور آپ ہمارے طریقے میں تبدیلی نہیں پائینگے]

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے اور قرآن میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ہے کہ جب انبیاء اپنی امت میں پیغام خدا لیکر آئے تو ان کی امت نے اسکی تکذیب کی۔ قوم نے اپنے اپنے کو نبی طرح طرح کی اذیتیں پہونچائیں

اورتعلیماتِ خداوندی کا استہزاء کیا گیا جسکے نتیجے میں عذابِ الٰہی نے ان کو دبوچ لیا۔سورۂ رعد میں اللہ نے اپنے نبی کو اس سلسلے میں مخاطب کر کے فرمایا ہے:

وَلَقَدِ اسْتُهْزِءَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۵

[اوراے رسول ﷺ آپ سے پہلے بھی بہتیرے پیغمبروں کی ہنسی اڑائی گئی ہے تو میں نے چندروز کافروں کو مہلت دی پھرانہیں لے ڈالا۔تو میرا عذاب کیا سخت تھا]

جن امتوں نے خداوندی احکام وتعلیمات کی خلاف ورزی کی خدانے ان کو ان کی نافرمانی کی پاداش میں ہلاک کر دیا اوران کی جگہ دوسری امت برپا کردی۔اسکی متعدد مثالیں تاریخ اورقرآن سے ملتی ہیں۔وہی امتیں جو کسی زمانے میں اپنے عروج پر ہوتی تھیں کس طرح اپنی بدکرداری اوراحکامِ الٰہی کی نافرمانی کی سزامیں عذابِ الٰہی کا مورد ہوکر تباہ وبرباد ہوجاتی ہیں۔قوم عاد وثمود کے بارے میں قرآن میں ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَاد ● إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَاد ● الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِىْ الْبِلَاد ● وَثَمُودَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۶

[کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے قومِ عاد کے ساتھ کیا کیا یعنی ارم والے درازِ قامت جن کا مثل تمام شہروں میں کوئی پیدا ہی نہیں کیا گیا اورقومِ ثمود کے ساتھ کیا کیا تو وادیٔ قرا میں پتھر تراش کر کے گھر بناتے تھے]

ان دواولوالعزم نبیوں کے انکار وتکذیب کے ساتھ ساتھ ان کی قوموں میں انتہائی درجے کے ذمائم اخلاق بھی پیدا ہوگئے تھے۔

بائبل میں انکے اخلاقی زوال کا تذکرہ بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے،خود نبی اسرائیل کے انبیاء کن الفاظ میں ان کی اخلاقی حالت کی تصویر کشی کرتے ہیں ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو:

''دین دار آدمی دنیا سے جاتے رہے لوگوں میں کوئی راستباز نہیں،وہ سب کے سب گھات میں بیٹھے ہیں کہ خون کریں،ہرشخص جال بچھا کر اپنے بھائی کا شکار کرتا ہے۔ان کے ہاتھ بدی میں پُھرتیلے ہیں۔حاکم رشوت مانگتا ہے اورقاضی بھی یہی چاہتا ہے اور بڑے آدمی اپنی حرص کی باتیں کرتے ہیں اوریوں سازش کرتے ہیں۔ان میں سب سے اچھا تو اونٹ کٹارے کی مانند ہے اورسب سے راستباز خاردار جھاڑی سے بدتر ہے''۔۷

بائبل کے میکاہ باب۲،میں مزید صراحت ہے:

''ان پرافسوس جوبدکردار ی کے منصوبے باندھتے ہیں اوربستر پر پڑے پڑے شرارت کی تدبیریں ایجاد کرتے ہیں اورصبح ہوتے ہی ان کوعمل میں لاتے ہیں کیونکہ ان کو اس کا اختیار ہے۔وہ لالچ سے کھیتوں کوضبط کرتے اور گھروں کوچھین لیتے ہیں''۔۸

اس بدکرداری اور نافرمانی کے نتیجے میں جوعذاب آیااور گنہگاروں کی سرزمین جس طرح تباہ وبرباد ہوئی اسکا ذکر بھی بائبل کی زبان میں ہی ملاحظہ کر لیجئے:

''میں پہاڑوں کیلئے گریہ وزاری اور بیابان کی چراگاہوں کیلئے نوحہ کروں گا کیونکہ وہ یہاں تک جل گئیں کہ کوئی ان میں قدم نہیں

رکھتا۔ چوپایوں کی آواز سنائی نہیں دیتی، ہوا کے پرندے اور مویشی بھاگ گئے۔ میں یروشلیم کو کھنڈر اور گیدڑوں کا مسکن بناؤنگا اور یہوداہ کے شہروں کو ایسا ویران کردونگا کہ کوئی باشندہ نہ رہے گا اور خداوند فرماتا ہے اسلئے کہ انہوں نے میری شریعت کو جو میں نے ان کے آگے رکھی تھی ترک کردیا اور میری آواز کو نہ سنا اور اسکے مطابق نہ چلے''۔[9]

مذکورہ تعلیمات تو ہمیں بائبل کی روشنی میں ملتی ہیں۔

دوسری جانب قرآن کا بھی ارشاد ہے کہ کوئی امت دنیا میں ہمیشہ نہیں رہتی بلکہ ہدایت کی زندگی محدود ہوتی ہے اور اس دنیا میں اسکی میعاد مقرر ہوتی ہے جس کے بعد اس پر اسی کی نافرمانی اور بدکرداری کے نتیجے میں زوال اور انحطاط طاری ہوجاتا ہے اور اسکی جگہ ایک دوسری امت جو تعلیماتِ الٰہی کی پیروی کرنے والی ہوتی ہے وجود میں آجاتی ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ سابقہ امتوں سے جو اپنی نافرمانی اور بدکرداری کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں ان سے عبرت حاصل کرو۔ ارشادِ قرآنی کے مطابق ہر امت کی ایک میعاد ہوتی ہے اور ہر میعاد کیلئے ایک کتاب ہوتی ہے جس سے وہ امت ہدایت حاصل کرتی ہے لیکن ایک مدت کے بعد وہ کتابِ الٰہی سے روگردانی کرلیتی ہے اور پھر اسکے نتیجے میں گمراہ ہوکر عذابِ الٰہی کا مورد بن جاتی ہے۔ اسی کی جانب قرآن کی درج ذیل آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ [10]

[ہر امت کیلئے ایک میعاد ہوتی ہے، جب ان کی میعاد پوری ہوجاتی ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ ہی آگے بڑھ سکتے ہیں]

جس طرح سابقہ امتوں کی میعاد مقرر تھی اسی طرح امتِ قرآن کی بھی میعاد مقرر ہے اور ہر میعاد قیامت کے دن تک ہے اور قیامت کیلئے جو وقت خدا کی طرف مقرر ہے، اس سے ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ قرآن مجید نے سابقہ امتوں کی نافرمانی اور سرکشی اور اسکے نتیجے میں قانونِ الٰہی کے مطابق ان کی ہلاکت کی داستانیں بیان کیں تاکہ امت قرآن کی طرف متنبہ ہو اور عبرت حاصل کرے اور مشیتِ الٰہی کو جو ناقابل تبدیل ہے اور ماضی کی طرح مستقبل میں بھی جاری ہے پیش نظر رکھے اور سابقہ امتوں کی پیروی کرکے اسی انجام کی مستحق نہ بنے جس انجام کی سابقہ امتیں مستحق بنیں بلکہ احکام الٰہی کی پیروی کرکے قیامت کے دن اچھی جزاء کی مستحق بنے کیونکہ اللہ نافرمانی اور سرکشی کی سزا آئندہ بھی اسی طرح دیتا رہیگا جس طرح سابقہ امتوں کو دیتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں قرآنی آیات شاہد ہیں:

أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ● ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ ● كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ [11]

[کیا ہم نے اولین کو (ان کی سرکشی وگمراہی کی پاداش میں) ہلاک نہیں کردیا، اسی طرح پھر انکے بعد آخرین کو بھی ہلاک کریں گے۔ ہم مجرموں اور بدکاروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں]۔

ان آیات کے مطالعہ سے معلوم ہورہا ہے کہ خدا کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے۔ قرآن اپنی امت کو سابقہ امتوں کے واقعات سے عبرت حاصل کرکے عذاب الٰہی سے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اہلِ عرب یومِ جزاء اور عذابِ الٰہی کے وعدے پر استہزاء کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ آخر یہ وعدۂ عذاب کب پورا ہوگا یعنی روزِ جزا یا قیامت

کا دن کب آئیگا ؟ تو انکے اس قسم کے بیہودہ سوال کے جواب میں قرآن کہتا ہے:

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ● قُل لَّكُم مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ۱۲

[اور (استہزاء سے) کہتے ہیں کہ اگر تم (اپنے وعدے میں) سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا (اے رسولؐ) آپ ﷺ جواب میں کہہ دیجئے کہ تمہارے لئے ایک دن کی میعاد مقرر ہے جس سے تم ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہٹ سکتے]

حقیقت یہی ہے کہ قیامت کا دن ہی وہ دن ہوگا جب خدا انہیں (جن سے قرآن مخاطب ہے) اور دوسری امتوں کو انکے اعمال کی جزاء دیگا اسی دن کو قرآن نے یوم الجزاء، یوم الفصل، یوم العدل، یوم الوعید (وعدہ کا دن) اور یومِ عظیم وغیرہ متعدد ناموں سے موسوم کیا ہے۔ یہ خدا نے تمام امت کی پاداش کیلئے مقرر کیا ہے۔

جس طرح قرآن میں بنی اسرائیل (اور دوسری قوموں) کے عروج وزوال کا عبرت آموز ذکر ملتا ہے اسی طرح بائبل میں بھی کثرت سے ایسی عبارتیں نظر آتی ہیں جن میں بنی اسرائیل کے اعمال اور خدا کی طرف سے ان کی جزاء کا تذکرہ ہے۔ جن کا خلاصہ یہی ہے کہ جب تک کوئی قوم احکامِ الٰہی کی پابندی رہتی ہے۔ خدا کی طرف سے رحمتیں اس پر نازل ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب وہ بدکرداری اور سرکشی اور احکام الٰہی کی نافرمانی کرنے لگتی ہے تو خدا کے اٹل قانون وجزا اور ناقابل تبدیل سنت کے مطابق نعمتیں اس سے سلب ہوجاتی ہیں اور پھر وہ اپنے اعمال کی سزا میں عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ بنی اسرائیل کے عروج وزوال کا جو نظریہ قرآن نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہی نظریہ ہمیں خاص تفصیل کے ساتھ بائبل میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بائبل کا بنیادی موضوع ہی بنی اسرائیل ہیں۔ قرآن نے تو محض مسلمانوں کو عبرت دلانے کیلئے جابجا ان کا ذکر کیا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بائبل ضخامت کے اعتبار سے قرآن سے پانچ گنا بڑی کتاب ہے۔ لہٰذا اس میں تفصیل کی گنجائش قرآن سے زیادہ تھی۔ ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوگا کہ بائبل کا نظریۂ جزاء اور اقوام کے عروج وزوال کا فلسفہ وہی ہے جو قرآن نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ بائبل کتاب احبار میں ہے کہ:

''تم ان کاموں میں سے کسی میں پھنس کر آلودہ نہ ہوجانا کیونکہ جن قوموں کو میں تمہارے آگے سے نکالتا ہوں وہ ان سب کاموں کے سبب سے آلودہ ہیں اور ان کا ملک بھی آلودہ ہوگیا ہے۔ اسلئے میں اسکی بدکاری کی سزا اسے دیتا ہوں ایسا کہ وہ اپنے باشندوں کو اُگلے دیتا ہے۔ لہٰذا تم میرے آئین اور احکام کو ماننا''۔ ۱۳

بائبل زبور میں خدا کے انصاف کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے کہ:

''خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا، وہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہیں۔ پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائیگی۔ صادق زمین کے وارث ہونگے اور اسمیں ہمیشہ بسے رہیں گے''۔ ۱۴

شاید اسی کا حوالہ قرآنِ مجید نے ان الفاظوں میں دیا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۱۵

[اورتوراۃ کے بعد ہم نے زبور میں بھی لکھا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہونگے]

اسی اصول کے تحت خواہ وہ عادوثمود ہوں یا قوم یہود یا انکے علاوہ کوئی اورقوم خداتعالیٰ نے شدید نافرمان اور بے دین قوموں کواپنے عذاب سے تباہ و برباد کردیا اور پھر ان کی جگہ دوسری قوموں کوجو دین دار اوراحکامِ الٰہی کی پابند تھیں۔ملک کاوارث قراردیا۔انجیل میں بھی جابجا ایسی عبارتیں ہیں جوقوموں اورامتوں کوان کے اعمال کی جزادیئے جانے کاذکرکرتی ہیں مثلاً:

''کیونکہ جس طرح باپ اپنے آپ میں زندگی رکھتاہےاسی طرح اس نے بیٹے کوبھی اختیاربخشا کہ اپنے آپ میں زندگی رکھے بلکہ اسے عدالت کرنے کابھی اختیاربخشا اسلئے کہ وہ آدم زاد ہے،اس سے تعجب نہ کروکیونکہ وہ وقت آناہے کہ جتنے قبروں میں ہیں اسکی آوازسن کرنکلنےلگیں گے''۔۱۶

زمانے کےآخرمیں بھی ایساہی ہوگا کہ فرشتےنکلیں گےاورشریروں کوراستبازوں سے جداکرینگےاوراُنہیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔وہاں رونااوردانتوں کاپیسناہوگا۔۱۷

بائبل ہی میں پطرس کادوسراعام خط کی عبارت سے مزیداس کی وضاحت ہوتی ہے:

''جب خدانے گناہ کرنے والے فرشتوں کونہ چھوڑا بلکہ جہنم میں بھیج کرتاریک غاروں میں ڈال دیا تاکہ عدالت کے دن تک حراست میں رہیں اورنہ پہلی دنیاکوچھوڑا بلکہ بے دین دنیاپر طوفان بھیج کر راستبازی کے منادی کرنے والےنوحؑ کومع سات آدمیوں کے بچالیا اور صدوم اورعمورہ کے شہروں کوخاک سیاہ کردیا اورانہیں ہلاکت کی سزادی اور آئندہ زمانے کے بےدینوں کیلئے جائےعبرت بنادیا''۔

اورخدا کے اس دن کے آنے کا کیسا کچھ منتظر اورمشتاق رہناچاہئے جس کے باعث آسمان آگ سے پگھل جائیں گےاورعناصرحرارت کی شدت سےگل جائیں گےلیکن اسکے وعدے کے موافق ہم نئے آسمان ونئی زمین کا انتظار کرتے ہیں،جن میں راست بازی بسی رہےگی۔۱۸

زمین وآسمان کےتبدل کاذکرصرف بائبل ہی میں نہیں ہے،قرآن مجید میں زمین وآسمان کےتغیروتبدل کاذکر موجودہے،سورۂ ابراہیم میں ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۱۹

[جس دن زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اوراسی طرح آسمان بھی بدل دیئے جائینگے اورلوگ یکتا اورقہار خداکیلئے نکل کھڑے ہونگے]

قرآن اور بائبل کےمطالعہ سےمعلوم ہواکہ جب تک انسان اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتارہتاہے رحمتِ الٰہی اس پر نازل ہوتی رہتی ہے۔لیکن جب وہ خداکی نافرمانی وبدکرداری میں مبتلا ہوجاتاہے اپنے معبودِحقیقی کوسرے سے بھول جاتاہےتواب خداکا قانونِ جزاءعذابِ الٰہی کی شکل میں اسکواپنی گرفت میں لے لیتاہے۔لہٰذا عذابِ الٰہی سے بچنے کیلئے انسان کواحکامِ الٰہی کاپابندرہناضروری ہے۔

☆☆☆

❑ مطالعات

دستورِ ہند- ایک معروضی مطالعہ

عبدالرشید طلحہ نعمانی

کسی بھی ملک اور اجتماعی نظام کو چلانے، نظم ونسق کو برقرار رکھنے اور پرامن بقائے باہمی کو فروغ دینے کے لیے مضبوط و مستحکم آئین کی ضرورت ہے، یہی آئین کسی بھی مملکت کی بنیاد و اساس ہوتا ہے؛ جس کا تحفظ پورے نظام کو انتشار سے بچانے اور حق دار تک اس کا حق پہونچانے میں ممد و معاون بنتا ہے، اسی کے ذریعہ بنیادی نظریات وتصورات، اندورنی نظم ونسق کے اہم اصول اور مختلف شعبوں کے درمیان ان کے فرائض واختیارات کی حد بندی وتعیین ہوتی ہے۔ شہری، سیاسی اور انسانی حقوق کے تحفظات کے لیے دستور وآئین کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی گئی جو مملکت اور شہریوں کے حقوق کی پاس داری کر سکے۔ ملک کے لیے جو بھی قوانین وضع کیے جائیں گے وہ اسی دستور کی روشنی اور دائرہ میں ہوں گے۔ ہمارے ملک کے دستور کا نام 'بھارت کا آئین' ہے، جیسا کہ دستور کی دفعہ 393 میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

پندرہ اگست 1947ء کو ہمارا ملک انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوا اور آزادی کے تقریباً ڈھائی سال بعد آئین کا نفاذ عمل میں آیا، اس کے بعد سے ہندوستان ایک مکمل خود مختار جمہوری ملک بن گیا جس کا خواب ہمارے رہنماؤں نے دیکھا تھا اور جس کی آبیاری کے واسطے جام شہادت نوش کیا تھا، اس واقعے کو اب 70 سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے؛ جو ہمیں آئین پر عمل آوری کے حوالے سے دعوت احتساب دے رہا ہے۔

اس طے شدہ دستور کے آغاز میں جو جملے مرقوم ہیں وہ انتہائی چشم کشا اور بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ ملاحظہ ہو: ''ہم ہندوستانی عوام تجویز کرتے ہیں کہ انڈیا ایک آزاد، سماجوادی، جمہوری ہندوستان کی حیثیت سے وجود میں لایا جائے جس میں تمام شہریوں کے لیے سماجی، معاشی، سیاسی انصاف، آزادئ خیال، اظہار رائے، آزادئ عقیدہ و مذہب وعبادات، مواقع اور معیار کی برابری، انفرادی تشخص اور احترام کو یقینی بنایا جائے گا اور ملک کی سالمیت ویکجہتی کو قائم ودائم رکھا جائے گا۔''

آئین ہند:

26/نومبر 1949ء کو سات رکنی کمیٹی (جس کے چیئر مین ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر تھے) نے آئین کا مسودہ حکومت کو سونپا، جس کا نفاذ 26/جنوری 1950ء سے عمل میں آیا۔ اب تک اس آئین میں تقریباً 92/ترامیم ہو چکی ہیں۔ آئین سازی کے عمل میں دوسرے اراکین کے ساتھ ساتھ مسلمان اراکین نے بھی حصہ لیا۔ جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، بیرسٹر آصف علی، خان عبدالغفار خاں، محمد سعداللہ، عبدالرحیم چودھری، بیگم اعزاز رسول اور مولانا حسرت موہانی کے نام شامل ہیں۔ اس دستاویز پر مولانا حسرت موہانی کے علاوہ سبھی اراکین اسمبلی نے دستخط کیے۔ اسمبلی کا آخری اجلاس 24/دسمبر 1949ء کو منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر راجندر پرساد کو اتفاق رائے سے

ہندوستان کا اولین صدر جمہوریہ منتخب کرلیا گیا۔ بھارت کے آئین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے طویل آئین ہے؛ جس میں انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔تفصیلات کے مطابق جمہوریہ ہند کا دستور کچھ اس طرح سے ہے۔

دستور ہند میں 395 دفعات (Articles)، 22 /ابواب (Chapters)، 12 /ضمیمے (Schedus، اور 02/تتمے (Appendix) ہیں۔ ملک کا یہ دستوروں اپنی بہت سی خوبیوں اور کچھ خامیوں کے باوجود دنیا کے بہترین دستور میں شمار کیا جاسکتا ہے۔لیکن یہ بھی ایک کڑوی حقیقت ہے کہ جس قدر پامالی و بے حرمتی دستور ہند کی کی گئی شاید ہی دنیا کے کسی دستور کی کی گئی ہو۔اور جتنا اس دستور کے الفاظ ومعانی، مطالب ونتائج سے کھلواڑ کیا گیا دنیا کے کسی ملک کے دستور کے ساتھ نہیں کیا گیا۔حکمراں طبقہ نے عوام کو آئین کی طاقت اور اس کی اہمیت سے واقفیت ہی نہیں ہونے دیا اور عوام نے بھی کبھی دستور کے مکمل نفاذ کے بارے میں کوئی پرزور تحریک نہیں چلائی، خصوصاً مسلمانوں نے تو اس سلسلہ میں کافی کوتاہی برتی۔ بھارت میں ثقافتی فاشزم کو سیکولرزم کے سانچے میں ڈھالا گیا اور ایک مذہب کے عقائد کو ملک کے استحکام و یک جہتی کے نام پر جبراً مسلط کیا گیا۔اب تو ملک میں آر ایس ایس کی سرپرستی میں بی جے پی حکومت کررہی ہے۔این آر سی اور شہریت ترمیمی قانون کے تناظر میں یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی ہے کہ موجودہ حکومت ملک میں کس طرح کا دستور اور قانون نافذ کرنا چاہتی ہے۔

ہمارے آئین میں انسانی حقوق کے تحفظ کی مختلف دفعات کے باوجود بڑے پیمانے پر وطن عزیز میں انسان کے بنیادی حقوق کی پامالی ہورہی ہے، کہیں بولنے پر پابندی ہے تو کہیں کھانے اور لباس پر پابندی ہے۔کبھی یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا ہوّا کھڑا کیا جارہا ہے، تو کبھی مسلمانوں سے ان کی مذہبی آزادی سلب کرنے کی ناپاک کوشش ہورہی ہے۔غرض وطن عزیز میں اقلیتوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کا تحفظ ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کسی بھی حکومت کو جمہوری حکومت اسی وقت کہا جاسکتا ہے جب وہ انصاف، آزادی، مساوات، اور اخوت کے تقاضوں کو پوار کرسکے؛ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

انصاف: اس میں سماجی، معاشی، سیاسی انصاف شامل ہیں۔

آزادی: اس ضمن میں خیالات، اظہار رائے، عقیدہ، ایمان اور عبادت کی آزادی شامل ہے۔

اخوت: اس کے تحت ہر شہری کا وقار اور ملک کی سلمیت کے لیے ممکنہ کوششیں شامل ہیں۔

اب ہم ان نکات کا بغور جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ آزادی ہند کے بعد سے آج تک حکمران جماعتوں نے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ دستوری انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کبھی ایماندارنہ کوشش نہیں کی۔ مسلمانوں کے سماجی انصاف کی بات کی جائے تو آج بھی تقسیم ہند کا جواز دیتے ہوئے سب سے بڑی اقلیت کو اس کا موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے جبکہ یہ بات عیاں ہے کہ 1857 کے غدر میں سب سے زیادہ مسلمانوں نے خون بہایا اور آزاد بھارت کے لیے اپنی جان و مال تک کو نچھاور کردیا۔لاکھوں علماء کرام، صحافیوں اور دانشوروں کو انگریزوں نے شہید کیا اس کے برعکس زعفرانی طاقتیں انگریزی حکومت کی دلالی کرتی رہیں۔

باشندگانِ وطن کے بنیادی حقوق:

آبادی کے لحاظ سے ہندوستان، دنیا کی سب سے بڑی پارلیمانی، غیر مذہبی جمہوریت ہے، اس کے دستور وآئین کے کچھ اہم امتیازات ہیں، یہاں کے شہریوں کو خود اپنی حکومت منتخب کرنے کا بھرپور حق حاصل ہے اور یہاں عوام ہی کو سرچشمۂ اقتدار واختیار مانا جاتا ہے، اس طرح تمام باشندے بلاتفریق مذہب وملت ''ایک مشترکہ جمہوریت'' کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

ذیل میں شہریوں کے چند اہم اور بنیادی حقوق قدرے تفصیل کے ساتھ درج کیے جارہے ہیں؛ جن کے بہ غور مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہمارا آئین پوری طرح سے انسانی حقوق کا پاس دار اور مذہبی آزادی کا علم بردار ہے۔

حق مساوات:

ملک میں رہنے والے تمام ہی افراد باعتبار انسان یکساں حقوق کے مالک ہیں اور آئینی اعتبار سے ان کے اندر کسی قسم کی اونچ نیچ، ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی تفریق نہیں۔ حقوق و اختیارات میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا آئین واضح طور پر مساویانہ حقوق کا پاسدار ہے جیسا کہ آئین کی دفعہ 15,14 میں کہا گیا ہے۔ ''مملکت کسی شخص کو ملک کے اندر قانون کی نظر میں مساوات یا قوانین کے مساویانہ تحفظ سے محروم نہیں کرے گی۔'' اور ''مملکت محض مذہب، نسل، ذات، جنس، مقام پیدائش یا ان میں سے کسی کی بناء پر کسی طرح کا امتیاز نہیں برتے گی۔'' سرکاری ملازمت کے سلسلے میں تمام باشندگان کو ملے ہوئے حقوق کا ذکر آئین کی دفعہ 16 میں کیا گیا ہے۔ ''تمام شہریوں کو مملکت کے کسی عہدے پر ملازمت یا تقرر سے متعلق مساوی موقع حاصل ہوگا۔''

حق آزادی:

حق مساوات کے ساتھ ہی ایک جمہوری آئین کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہاں کے رہنے والے مختلف قسم کی آزادی کے حامل ہوں۔ ان میں اظہار رائے کی آزادی بھی ہوسکتی ہے اور مختلف جلسے، انجمنیں اور جلوس وغیرہ منعقد کرنے، تنظیمیں اور تحریکیں بنانے اور چلانے، آزادانہ طور پر پورے ملک کا سفر کرنے، نیز سرمایہ کاری کی آزادی اور جان و مال کی آزادی بھی ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے باوقار آئین میں کہا گیا ہے۔ دفعہ 19 تا 22 میں لکھا ہے ''مملکت کے تمام شہریوں کو حق حاصل ہوگا:

(الف) مملکت کے ہر ایک حصہ میں تقریر اور اظہار کی آزادی کا۔

(ب) امن پسند طریقے سے اور بغیر ہتھیار کے جمع ہونے کا۔

(ج) انجمنیں یا یونین قائم کرنے کا۔

(د) بھارت کے سارے علاقے میں آزادانہ نقل وحرکت کرنے کا۔

(ھ) بھارت کے کسی بھی حصے میں بود و باش کرنے اور بس جانے کا۔

(ی) کسی پیشے کے اختیار کرنے یا کسی کام دھندے، تجارت یا کاروبار چلانے کا''۔

مذہب کی آزادی:

انسانی فطرت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر سب سے حساس مذہبی جذبہ ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہی مختلف افراد میں جنگ و جدل کا جذبہ نظر آتا ہے۔ یہ بات ان ملکوں میں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے جہاں مختلف مذاہب کے پیروکار رہتے ہوں۔ ہمارے ملک کا اس سلسلہ میں بہت نمایاں مقام ہے؛ کیونکہ یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے سیاسی قائدین نے بڑی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا کہ انھوں نے یہاں کسی مذہب کو خاص اہمیت نہ دے کر سب کو برابر اور یکساں حقوق دیئے۔ اس لئے آئینی اعتبار سے ملک کے ہر ایک شہری کو اپنے مذہب پر آزادانہ عمل کرنے، اس کی تبلیغ و تشہیر کرنے اور اس کے اصولوں پر چلنے کی مکمل آزادی دی گئی، اس سلسلے میں آئین کی دفعہ 25 میں کہا گیا ہے۔ ''تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی کرنے کا مساوی حق حاصل ہے۔''

ثقافتی اور تعلیمی حقوق:

ہمارا ملک مختلف تہذیبوں کا امین اور مختلف تعلیمی

نظریات کا گہوارہ ہے اسی وجہ سے یہاں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ تمام ہی لوگوں کو اپنی تہذیب وثقافت اور علم و ادب کی حفاظت کے فروغ کے حقوق حاصل ہوں۔ یہاں کے ہرایک شہری کو حصول تعلیم کی آزادی اور اپنے شعائر وثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے کا اختیار دیا جائے۔ اس سلسلے میں آئین کی دفعہ 29 میں کہا گیا ہے۔ ''بھارت کے علاقے میں یا اس کے کسی بھی حصے میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقے کو جس کی اپنی جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہو اس کو محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔'' آئین کی دفعہ 30 میں یہ بھی کہا گیا ہے۔ ''تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کے نام پر ہوں یا زبان کے، اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام کا حق حاصل ہوگا۔''

جائیداد کا حق:

مملکت میں رہنے والوں کو آئینی اعتبار سے یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کو اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا ہے اور اسے اپنی جائیداد فروخت کرنے یا کسی دوسرے کی جائیداد خریدنے خواہ وہ ملک کے کسی بھی حصے میں ہو، کا اختیار حاصل ہوگا۔ ملک کے ہر شہری کو یہ بھی حق دیا گیا ہے کہ وہ متعلقہ قوانین کی رعایت رکھتے ہوئے اپنی املاک و جائیداد اور ان سے حاصل شدہ آمدنی کو کسی بھی طرح اپنے اوپر خرچ کرسکتا ہے۔ یا کسی تنظیم، تحریک یا کسی اور ملک کے فلاحی و رفاہی کاموں پر خرچ کرسکتا ہے۔

دستوری چارہ جوئی کا حق:

ہمارے آئین کے تیسرے حصے میں ضبط کئے گئے حقوق کو بحال کرانے اور ان کی حفاظت کے لئے سپریم کورٹ و دیگر عدالتوں سے چارہ جوئی کرنے کا حق سب کو حاصل ہے۔ متعلقہ عدالتوں کو ان حقوق کی بحالی اور تحفظ کے لئے ہدایات یا احکام یا مختلف خصوصی فرمان جاری کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ آئینی اعتبار سے عدالتی چارہ جوئی کے حق کو محض دستور میں بیان کی گئی متعلقہ دفعات کے تحت ہی معطل کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں پارلیمنٹ کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ یہ طے کرے کہ کون سے بنیادی حقوق کس حد تک کسے دیئے جائیں۔ غرض کہ آئینی اعتبار سے ملک کے ہر ایک شہری کو ہی کسی بھی معاملے میں دستوری چارہ جوئی کا پورا پورا حق دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے باوقار آئین میں جس طرح سے عوام الناس کو بالادستی حاصل ہے اور یہاں کے رہنے والوں کے بنیادی حقوق کا جس طرح لحاظ رکھا گیا ہے اس بنا پر بلاخوف تردید یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ ہمارا آئین پوری طرح سے انسانی حقوق کا پاس دار اور اس کا سچا علمبردار ہے۔ ضرورت صرف اس کے غیر جانب دارانہ اور عادلانہ نفاذ کی ہے؛ جس کے لیے انتھک محنت و مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے (بہ حوالہ آئین ہند؛ حقوق انسانی کا سچا علم بردار، ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ 2، جلد: 90)

کرنے کا اہم کام:

اس وقت ہم کروڑوں مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمیں دستور و آئین سے متعلق بالکل معلومات حاصل نہیں، ہمیں اس بات کا پتہ ہی نہیں کہ بحیثیت شہری اور مسلمان ہونے کے ہمیں کیا کیا حقوق حاصل ہیں، ہمیں اس کی خبر ہی نہیں کہ آئین نے ہمیں کیا دیا ہے اور ہم دی گئی مراعات سے کیا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور کیا اٹھا سکتے ہیں؟؟۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کیا جائے اور موجودہ حالات کو سامنے رکھا جائے تو یہ ایک اچھا موقع ہے کہ ہم آئین ہند کا بہ طور خاص مطالعہ کریں، اس حوالے سے ناخواندہ لوگوں میں شعور بیدار کریں، ملی تنظیمیں اس سلسلہ میں ورک شاپس کا انعقاد عمل میں لائیں، تب کہیں جا کر ہم مضبوط بنیادوں پر آگے بڑھ سکتے ہیں اور بلاخوف ملک میں ہو رہی تاناشاہی کا جواب دے سکتے ہیں۔

☆☆☆

❑ تجزیہ و حل

موجودہ عالمی مسائل کا حل اور سیرت رسول ﷺ

سید احمد ومیض ندوی
(استاذ حدیث: دارالعلوم حیدرآباد)

دورِ حاضر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا دور ہے، مواصلات کی حیرت انگیز ترقی نے ساری دنیا کو گلوبل ولیج میں تبدیل کردیا ہے، انٹرنیٹ کی ایجاد نے معلومات کے انبار لگا دیئے ہیں، علم وسائنس کے بڑھتے قدموں نے وسائلِ زندگی میں بے تحاشہ اضافہ کردیا ہے، ہر قسم کے سامان آرائش کی فراوانی ہے، لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے، دورِ حاضر کی تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وسائل کی بہتات کے باوجود موجودہ دور کا انسان مسائل میں گھرا ہوا ہے، اس وقت ساری انسانیت انتہائی پیچیدہ قسم کے مسائل میں گرفتار ہے، مغربی ممالک ہوں کہ مشرقی دنیا، ترقی یافتہ علاقے ہوں کہ پسماندہ ممالک ساری انسانی آبادی الجھنوں کا شکار ہے، عالمگیر نوعیت کے مسائل کا سامنا ساری دنیا کو ہے، اور ایسا بھی نہیں کہ ان مسائل کے حل کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوتی بلکہ دنیا بھر کے دانشور اور بے پناہ دماغی صلاحیتوں کے حامل مفکر اور صفِ اول کے مدبر بار بار سر جوڑ کے بیٹھتے ہیں اور مسائل کے حل کے لیے عالمی کانفرنسوں اور سیمیناروں کا انعقاد عمل میں لایا جاتا ہے، اور بعض مسائل ایسے ہیں جن کے حل کے لیے اقوام متحدہ کی نگرانی میں باقاعدہ بیٹھکیں ہوتی ہیں، مگر نشستند وخوردند وبرخاستند کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

انسانیت کو لاحق مسائل کا حل وہی ذات کرسکتی ہے جو انسانوں کی خالق ہے، جس پروردگار نے انسان کی شکل میں حیرت انگیز مشین بنائی ہے وہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ اس مشین کو کیا کمزوریاں لاحق ہوسکتی ہیں اور اس میں آنے والی خرابیوں کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے چنانچہ اس خالق کائنات نے جہاں حضرت انسان کو پیدا فرمایا وہیں اس کے مسائل کے حل کے لیے حضرات انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہؐ کو بھیج کر قیامت تک پیدا ہونے والے نت نئے مسائل کے حل کا سامان فراہم فرمایا، اس وقت انسانیت جتنے مسائل سے دوچار ہے ان کا حل صرف اور صرف سیرت رسولؐ اور تعلیمات اسلام میں ہے۔

اس وقت سب بڑا مسئلہ جس سے دنیا کے سارے ممالک دوچار ہیں، تحفظ وسلامتی اور انسانی حقوق کی حفاظت کا ہے، دنیا کے ہر خطہ میں انسان عدم تحفظ کا شکار ہے، انسانی خون ارزاں سے ارزاں ہوتا جارہا ہے، گزشتہ صدی میں دنیا دو عظیم جنگوں کا سامنا کرچکی ہے، جن میں لاکھوں انسان مارے گئے۔ ان دو جنگوں کے باوجود حالات میں تبدیلی نہ آسکی، اب دنیا کی صورتِ حال یہ ہے کہ دھماکے روز کا معمول بن چکے ہیں، کسی دن کے اخبارات دھماکوں کی خبروں سے خالی نہیں ہوتے، اور ایک ایک دھماکے میں سیکڑوں لوگ ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوتے ہیں اور لاکھوں کی املاک تباہ ہوتی ہے، عراق میں دس لاکھ سے زائد شہری مارے گئے،

افغانستان میں تباہی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، بوسینا کی قیامت صغریٰ اب تک ذہنوں سے محو نہیں ہوئی، جہاں کی اجتماعی قبروں سے اب تک نعشیں برآمد ہورہی ہیں۔جن ممالک کو اپنے سیکوریٹی نظام پر ناز ہے وہاں بھی انسانی جان کو خطرات لاحق ہیں امریکہ جیسے سپر پاور ملک میں اچانک فائرنگ کے واقعات معمول بن چکے ہیں، اسکولوں میں دن دھاڑے فائرنگ ہوتی ہے، شاپنگ مالوں میں دھماکے ہوتے ہیں، الغرض پوری دنیا بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہے، سلامتی وتحفظ کے مسئلہ پر ہر ملک انتہائی حساس ہے، سلامتی کو یقینی بنانے کے لئے نت نئے مہلک ہتھیار تیار کئے جارہے ہیں، ہر ملک اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ دفاع پر خرچ کررہا ہے، اس سب کے باوجود کہیں انسانوں کو تحفظ حاصل نہیں، سیرت رسول ﷺ اس کا حل بتاتی ہے، آپ ﷺ کی آمد سے پہلے قتل وغارت گری اور لوٹ کھسوٹ عام تھی، معمولی باتوں پر جنگ چھڑ جاتی تھی اور چالیس چالیس برس تک جاری رہتی تھی، مختلف قبائل میں آپسی رسہ کشی عروج پر تھی، ایسے نازک حالات میں رحمتِ عالم ﷺ نے اپنی پاکیزہ تعلیمات کے ذریعہ ایسا انقلاب برپا کردیا کہ خونخوار انسان امن وسلامتی کے علمبردار بن گئے، ایک دوسرے کی جان کے درپے رہنے والے ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے والے بن گئے، عورتوں کو مکمل تحفظ حاصل ہوگیا، آپ ﷺ نے انسانی جان کی عظمت بڑھادی، خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر صاف اعلان کیا کہ تمہارا خون تمہارا مال ایک دوسرے کے لیے حرام ہے جس طرح یہ دن یہ شہر قابل احترام ہے، جرائم کے انسداد اور جان ومال کے تحفظ کے لیے آپ نے لوگوں میں ایک دوسرے کے حقوق کا احترام اور ان کی ادائیگی کی فکر پیدا کی، اور آخرت میں جوابدہی کا احساس پیدا کیا، چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ہر شخص خوف خدا سے سرشار ہوتا تھا، دوسروں پر ظلم تو دور رہا کسی کے بارے میں معمولی بات کہنا بھی ان کے لیے گراں گزرتا تھا، فکر آخرت اور مرنے کے بعد کی زندگی میں ہونے والے حساب وکتاب کے یقین کے بغیر حقوق انسانی کا تحفظ ممکن نہیں اور نہ ہی انسانی جانوں کے اتلاف کا یہ لامتناہی سلسلہ ختم ہوسکتا ہے، احساس جوابدہی اور آخرت کی سزا کے ڈر کے ساتھ جرائم اور قتل وغارت گری کے سدباب کے لیے آپ نے حدود وقصاص اور تعزیرات کا مؤثر نظام قائم فرمایا، قاتل کی سزا قصاص اور چور کے لیے قطع ید، شراب نوشی پر اسّی کوڑے اور شادی شدہ کے زنا میں مبتلا ہونے اور گواہوں کے ذریعہ ثابت ہونے پر سنگساری کی سزا مقرر فرمائی، موجودہ مغربی دنیا ان سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیتی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ ایک قاتل پر حد جاری کرنا ہزاروں افراد کے تحفظ کا ضامن ہے، چنانچہ حدود وقصاص کا یہ نظام جن مسلم مسلکوں میں رائج ہے وہاں قتل وجرائم کے واقعات کی شرح انتہائی کم ہے۔

دوسرا عالمی مسئلہ جس سے پوری دنیا دوچار ہے وہ غربت اور بھکمری ہے، آج کی مہذب دنیا میں جہاں سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی سے اسباب زندگی اور وسائل آرائش کی بہتات ہے، مختلف ملکوں میں لاکھوں افراد نان شبینہ کے محتاج ہیں۔افریقی ملکوں میں لاکھوں باشندے ایسے ہیں جنہیں بھوک کی شدت نے ہڈی کے ڈھانچوں میں تبدیل کردیا ہے، فاقہ کے سبب ہر سال لاکھوں افراد بلک بلک کر جان دے رہے ہیں، خود ہمارے ملک میں بھی خط افلاس کے نیچے زندگی گزارنے والوں کی شرح چالیس فیصد سے زائد ہے، لاکھوں ہندوستانیوں کو ایک وقت کا صحیح کھانا نصیب نہیں حتیٰ کہ پینے کا پانی تک میسر نہیں، سیرت رسول میں اس کا علاج موجود ہے، آپ نے زکوٰۃ کا نظام قائم فرمایا، اس سے ہٹ کر غریب رشتہ داروں، پڑوسیوں اور ضرورت مند انسانوں کی حاجت برآری کی تلقین فرمائی، یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی، اگر صحیح معنی میں سارے صاحب نصاب مسلمان اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالنے لگیں تو امت مسلمہ کا کوئی فرد بھوکا نہیں رہے

گا، نبی کی ان تعلیمات کو اگر دنیا کے سارے انسان اپنا لیں تو غربت کے خاتمہ میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

ایک اور عالمی مسئلہ جس نے عالمی قائدین کی نیند حرام کردی ہے معاشی بحران کا ہے، معاشی بحران اس وقت سارے یوروپ اور امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، امریکہ کے بیسوں بینکوں کا دیوالیہ ہو چکا ہے، بیسیوں کمپنیاں ٹھپ پڑ چکی ہیں، مہنگائی روز افزوں ہے عام اشیاء کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگی ہیں، سیرت رسول ﷺ اور قرآنی تعلیمات میں اس مسئلہ کا شافی علاج ہے، موجودہ معاشی بحران دراصل سودی نظام معیشت کی دین ہے، اسلام بلا سودی نظام معیشت پیش کرتا ہے، سودی نظام پر مبنی بینکاری فیل ہو چکی ہے، خود مغرب کے صفِ اول کے ماہرین معاشیات اس کا اعتراف کر چکے ہیں اور خود مغربی حلقوں سے بلاسودی اسلامی بینکنگ سسٹم کے لیے آواز بلند ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، چنانچہ سود پر مبنی معیشت اپنا بوریہ بستر لپیٹ رہی ہے، اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے، کہ انسانیت نبی رحمت کے دامن سے وابستہ ہو جائے، اور آپ کے لائے ہوئے نظام معیشت کو رواج دے۔

موجودہ دور کی ایک لعنت جو عالمگیر شکل اختیار کر چکی ہے وہ ذات پات اور رنگ ونسل کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کی لعنت ہے، نسلی امتیاز اور قومیت وعلاقائیت کے تعصّبات انتہا کو پہنچ چکے ہیں، یوروپ اور امریکہ جیسے حقوق انسانی کے دعویدار ملکوں میں کالے گوروں میں امتیاز عام ہے، گورے کالوں سے اس درجہ نفرت کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ کھانے تک میں عار خیال کرتے ہیں چنانچہ گوروں کے ہوٹلوں میں کالوں کا داخلہ ممنوع ہے، نبی نے سرے سے اس کا خاتمہ کر دیا، آپ نے بتایا کہ انسانوں کے درمیان رنگ ونسل اور قومیت کی بنیاد پر تفریق دراصل انسانیت کے ساتھ ظلم ہے، سارے انسان آدم کی اولاد ہیں سب برابر کے حقوق رکھتے ہیں، انسانوں میں اگر فرق کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اخلاق وکردار اور تقویٰ کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، آپ نے ایک ہی جھنڈے تلے صہیب رومی کو بھی لایا اور سلمان فارسی کو بھی، بلال حبشی کو عربوں کا سردار بنایا، نسلی امتیاز اور علاقائی عصبیت کی لعنت سے نجات سیرت رسول ﷺ ہی سے ممکن ہے۔

موجودہ دور کا ایک عالمی مسئلہ بدعنوانی اور کرپشن کا ہے، اس وقت پوری دنیا اس لعنت میں گرفتار ہے کرپشن سارے نظام کو کھوکھلا کر رہا ہے، ہمارا ملک تو بدعنوان ملکوں میں سرفہرست سمجھا تا ہے، جہاں بدعنوانی سیاسی زندگی کا جزو لاینفک سمجھی جا رہی ہے، آئے دن اسکامس منظر عام پر آرہے ہیں ۲۰۱۰ء تو حکومت کے لیے اسکنڈلوں کا سال رہا، G2 اسپکٹرم اسکام، سوسائٹی اسکام، کامن ویلتھ گیمز اسکام، پتہ نہیں کن کن ناموں کے اسکام سامنے آئے، بدعنوانی قوانین سے ختم نہیں کی جا سکتی اس کے لیے جب تک سیاست دانوں میں احساس جوابدہی نہ پیدا ہو، بدعنوانی کا خاتمہ ممکن نہیں۔

اسی طرح آج کا ایک اہم مسئلہ خاندانی نظام کا بکھراؤ اور معاشرتی زندگی کا عدم استحکام ہے جو اس وقت مغربی معاشروں کو تباہی کے دہانے پر پہنچا رہا ہے، اسلامی تعلیمات کے بغیر مستحکم خاندانی نظام ممکن نہیں، مغربی معاشرے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں، شادیوں کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے، ۵۰ فیصد سے زائد نوجوان لڑکیاں کنواری مائیں بن رہی ہیں، بیشتر شادیوں کا انجام طلاق کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے، مغربی ممالک کے بچے ماں باپ کی شفقت سے محروم ہیں، ماں باپ اولاد پر کنٹرول کھوتے جا رہے ہیں، کامیاب خاندانی اور عائلی زندگی صرف اسلام اور سیرتِ رسول پیش کرتی ہے، مغرب اگر اپنی بقا چاہتا ہے تو اسے معاشرتی زندگی کی نبوی تعلیمات کو اپنانا ہوگا، اسلام خاندان کے ہر فرد کے حقوق وفرائض کا ایک مکمل اور مربوط نظام رکھتا ہے اور عورت

اورمرد میں سے ہر ایک کا دائرہ متعین کرتا ہے،بہترین خاندان کی تشکیل کے لیے عورتوں پر گھریلو تربیت کی ذمہ داری ڈالتا ہے۔

فحاشی وعریانیت اور جنسی بے راہ روی آج کے دور کا ایک انتہائی پیچیدہ مسئلہ بن چکی ہے، پوری دنیا اس کی لپیٹ میں ہے، مغربی ملکوں میں فحاشی کو قانونی درجہ حاصل ہو چکا ہے،آزادی کے نام پر انسانوں کو حیوانوں کی صف میں کھڑا کیا جارہا ہے، میڈیا جسے اچھے پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرنا چاہیے صرف غلاظتوں کی آماجگاہ بن چکا ہے،مغربی معاشرہ کے انسان کتوں کی طرح بے حجابانہ جنسی ہوس پوری کررہے ہیں، سیرت رسول ﷺ ہی دنیا کو اس لعنت سے بچا سکتی ہے، آپ ﷺ کی تعلیمات میں حیا کو ایمان کا لازمی جز قرار دیا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے حیا باش وہر چہ خواہی کن،عورتوں کے لیے حجاب ضروری قرار دیا گیا ، مردوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی نگاہوں کی حفاظت کریں، بری نگاہ کو شیطان کا تیر قرار دیا گیا، بے حیائی اور عریانیت کے سبب اس وقت انسانیت ایڈز کی شکل میں عذاب الٰہی سے دوچار ہے، ہر سال دنیا بھر میں لاکھوں افراد لقمہ اجل بن رہے ہیں،ایڈز کے خدائی عذاب سے بچنے کے لیے ہر ملک اپنے بجٹ کا بڑا حصہ استعمال کررہا ہے، عالمی سیمناروں کا انعقاد عمل میں لایا جارہا ہے،لیکن اس سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی، جب تک سماج سے فحاشی اور برہنگی اور جنسی بے راہ روی کا خاتمہ نہ کیا جائے ایڈز سے نجات ممکن نہیں، نبوی تعلیمات کے نفاذ سے انسانیت اس عذاب سے چھٹکارا پا سکتی ہے۔

دور حاضر کی ایک خطرناک لعنت نشہ بازی اور منشیات کی لت ہے، عالمی صحت تنظیم Who کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں دو ارب لوگ شراب نوشی کرتے ہیں، ہندوستان میں سڑک حادثات میں روزانہ تقریباً ۴۸۲ لوگ مرتے ہیں، جس میں اکثر حادثوں کے پیچھے شراب نوشی کارفرما ہوتی ہے۔شراب کے ساتھ دیگر منشیات کا استعمال آج کے مشینی معاشرہ میں تیزی سے فروغ پارہا ہے، شراب ونشہ بازی کا بنیادی سبب موجودہ معاشرہ میں سکون سے محرومی ہے۔موجودہ مشینی مادہ پرست معاشرہ میں سکون نام کی چیز نہیں ہے، مادی وسائل رکھنے والا بھی پریشان ہے اور ان سے محروم افراد بھی مضطرب ہیں، سکون کے لیے بھنگ، شراب، گانجہ، ہیروئن، مارفین جیسی چیزوں کا سہارا لیا جاتا ہے، آج دنیا کی ساری حکومتیں ڈرگس اور منشیات کے مسئلہ سے حیران وپریشان ہیں، امریکہ میں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۳ء کے درمیان نشہ بندی مہم کے دوران اربوں ڈالر خرچ کر کے بھی مقصد حاصل نہیں ہوا، منشیات کی لعنت کا حل نبی نے بتایا ہے،شراب کی حرمت نازل ہوئی تو مدینہ کی نالیوں میں شراب پانی کی طرح بہنے لگی، شراب سے پاک معاشرہ نبوی تعلیمات،خوف خدا اور اخروی جزا وسزا کے یقین کے بغیر ممکن نہیں۔

الغرض اس مضمون میں موجودہ دور کے چند مسائل کا سرسری ذکر کیا گیا ہے،خلاصہ یہ کہ ہمارے سارے دردوں کا درماں سیرت رسول ہے، ہمارے سارے مسائل کا حل تعلیمات نبوی میں ہے۔آج کی انسانیت کو یہ راز کون بتائے؟ مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، لیکن خود سیرت رسول سے عاری مسلمان دوسروں کو کیسے تلقین کرسکیں گے، ربیع الاول میں صرف نعرے لگانے سے محبت رسول کا حق ادا نہیں ہوتا، بلکہ ہماری گردنوں پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو نبھانا پڑے گا، اپنے طرز عمل سے نبی کی پاکیزہ تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا، ظاہری بے روح حرکات سے ہم دنیا والوں کو تو فریب دے سکتے ہیں لیکن اللہ اور اس کے رسول کو فریب نہیں دے سکتے، آج کی انسانیت سیرت رسول اسے محرومی کے سبب تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے، اسے بچانے کے لیے قوم رسول ہاشمی کو آگے آنا ہوگا۔

☆☆☆

تعلیم و تربیت

پس وپیش میں مبتلا رہنا اور اپنے آپ پر اعتماد نہ کرنا

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

بہت سے والدین یہ شکایت کرتے ہیں کہ ان کا بچہ اپنا دفاع بھی نہیں کر پاتا، یا اس پر بہت جلدی دوسرے اثر انداز ہوجاتے ہیں یا اس پر غالب آجاتے ہیں، وہ جب بھی کوئی فیصلہ لینا چاہے تو بہت زیادہ تردد کا شکار رہتا ہے خواہ کتنا ہی چھوٹا معاملہ کیوں نہ ہو، دراصل اس کا تعلق حد سے زیادہ شرم سے ہے جس کا ہم ذکر کر چکے۔

اس طرح کے رویّے میں سب سے اہم کردار نوعمری میں طاری ہونے والی کیفیات ومزاج کا ہوتا ہے، والدین اگر اپنے ذہن پر زور ڈالیں تو غالب گمان یہی ہے کہ ان کو نظر آئے گا، کہ بچہ جب اپنے نمو کے تیسرے سال میں تھا تو اس کے اندر منفی نفسیات تھیں، سرکشی تھی، وہ والدین کی خواہشات کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، ۳؍سال کی عمر کا مرحلہ ہی دیکھیئے، جس کو بچپن میں ایک ''مشکل'' کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جیسے بچے کا والدین کی ہر بات پر ''نہیں'' کہنا، مگر یہی ''نہیں'' نوجوانی میں عزم ویقین اور عدم تردد شمار کیا جاتا ہے، جو نوعمر بچہ ہمیشہ اپنے والدین کی اطاعت ہی کرتا رہتا ہے اور کبھی بھی ان کے سامنے اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتا وہ بھی گویا تردد اور خوداعتمادی کی کمی کا شکار ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سارا مسئلہ مزاج ہی کا نہیں بلکہ ہوتا، خوداعتمادی، اصرار اور عزم جیسی صفات انسان کے اندر موجود اس یقین کے سبب پیدا ہوتی ہیں کہ اس کا موقف درست ہے اور وہ حق پر ہے، اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے، اصول، نظریات اور جو کچھ اپنے لیے مناسب سمجھے اس کو اختیار کرے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے نوعمروں کو یہ سمجھانا چاہیے بلکہ باور کرانا چاہیے کہ اپنے کو باعزم سمجھیں، اپنی ذات پر اعتماد کریں، خوداعتمادی میں کمی اور تردد کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذات کا احترام نہیں کرتا، اپنی اہمیت کو نہیں سمجھتا، کبھی یہ وجہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں اس طرح کی کوئی بات بیٹھی ہوتی ہے کہ کسی انسان کے لیے اپنی رائے رکھنا، اپنی فکر رکھنا، اپنا موقف رکھنا صحیح نہیں، بلکہ یہ معیوب ہے یا ممنوع ہے، اسی لیے سب سے پہلے نوجوان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ پر یقین واعتماد کرے اور پرعزم بنے اور اس کو اپنا حق سمجھے، کیونکہ وہ ان لوگوں میں اپنے کو شمار کرتا ہے جن کو یہ حق حاصل نہیں، اسی لیے آپ اس کو دیکھیں گے کہ وہ اس گمان کے خلاف جیسے ہی عمل شروع کرے گا اس پر خوف طاری ہوگا، کپکپاہٹ طاری ہوگی، ایسا یہ سوچ کر ہوگا کہ لوگ کہیں اس سے غصہ نہ ہوجائیں کیونکہ وہ اپنے دفاع کی کوشش کر رہا ہے، اپنی رائے اور اپنے موقف کا اظہار کر رہا ہے، کبھی معاملہ اس حد تک پہنچ جائے گا کہ وہ ''جرأت'' پر اپنے آپ کو کوسے گا اور ملامت کرے گا۔

اپنے بچے کو سکھایئے کہ وہ خود کو کیسے مخاطب کرے، وہ اپنے

آپ کو اس طرح خطاب کرے ''میرا حق ہے کہ میں پرعزم وارادہ رہوں، دوراندیش بنوں اور اپنا دفاع کروں''، بچہ اگر اپنے آپ کو اس طرح مخاطب کرے گا تو اس کے اثرات بہت طاقتور ہوں گے، اگر دن میں کئی کئی بار وہ اس کو دوہرائے گا تو مطلب ہوگا کہ لاشعوری طور پر اس کے اندر کچھ شعور بیدار ہو رہا ہے، اگر خود اعتمادی کی کمی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے تو آپ اس سے اجازت لے کر اس کا دفاع کیجئے اگرچہ افضل یہی ہے کہ وہ خود اس ذمہ داری کو اٹھائے اور خود اپنے اندر عزم ویقین پیدا کرے۔

جب وہ اچھی طرح یہ سمجھ لے کہ وہ بھی ایک پرعزم انسان ہے، تو پھر اس کو سکھائیے کہ وہ کس طرح ایسے مواقف اختیار کرے اور ان کا اظہار کرے کہ اس میں تردد اور خود اعتمادی میں کمی کا شائبہ نہ ہو، وہ کس طرح سوچے کہ مشکل مواقف میں اس کو کیا کرنا اور کیا بولنا ہے، اگر آپ بطور مثال اس طرح کے مواقف اس کے سامنے پیش کرسکیں تو یہ زیادہ افضل ہے، مثلاً آپ تھوڑی دیر کے لیے ایک دکاندار بن جائیے، آپ کا بچہ آپ کے پاس آپ ہی سے خریدا ہوا سامان واپس کرنے آئے اور آپ کو بتائے کہ جب خرید کر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ اس میں نقص ہے یا کوئی عیب ہے، اس تمثیل سے بچے کو حوصلہ ملے گا اور وہ اپنا اور اپنے حق کا دفاع کرنا سیکھے گا، اپنی مصلحتوں کا دفاع کرنے کا سلیقہ اور مطالبہ کرنے کی کیفیت سے واقف ہوگا، اس طرح کی تمثیل، تصوراتی مواقف، اختراعی مثالیں اور مفروض کردار کی ادائیگی کو لوگوں کے ان مواقف کی تبدیلی کے لیے بہت مفید ومؤثر سمجھا جاتا ہے جن سے وہ بھاگتے ہوں اور جن کو وہ برتنا ہی نہ چاہتے ہوں۔

اس کے بعد آپ اس کو سکھائیے کہ وہ زندگی کے دوسرے امور پر توجہ دے، زندگی کے دیگر امور میں سے نوجوانوں کے یہاں ایک مشکل مسئلہ اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی نہ کر پانا بھی ہوتا ہے، چنانچہ آپ اس کی اس طرح مدد کیجئے کہ وہ غصہ کے وقت غصہ کا اظہار کرسکے، ضرورت پڑے رونے کی تو وہ رو سکے، یا ہنسنے کی نوبت آئے تو ہنس کے اپنے احساسات کا اظہار کرسکے، اسی طرح زندگی کی خوشگواریوں اور لطف اندوزیوں سے لطف اندوز ہوسکے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر ابتدائی سالوں میں گھر کا ماحول ایسا ہوگا جس میں بچے کے احساسات وجذبات کو قبول کیا جاتا ہو تو یہی چیز اس کی نوجوانی میں اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی، کیونکہ بسا اوقات بہت سے بچوں کو اس سلسلہ میں تعاون کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گھر، اسکول اور معاشرے کی بے جا پابندیوں اور الجھنوں و بندشوں سے کچھ آزادی دلا سکیں، جو کہ مبالغہ کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔

تعاون نہ کرنے والے نوجوان:

کبھی کبھی ہم (بڑوں) سے کسی ایسے کام کا مطالبہ کیا جاتا ہے جس سے ہم کو بہت زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی، تو ہم اس کو جس قدر ممکن ہوتا ہے انجام دیتے ہیں، اسی طرح ہم کبھی کبھی کسی نوعمر سے ادنیٰ سے کام کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن اس ادنیٰ سے کام کو نہ کر پانے کی اصل وجہ کو سمجھنا ہمارے لیے دشوار ہوتا ہے، کبھی کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس ادنیٰ سے کام کو نہ کر پانے کی وجہ سے بڑی مشکل پیدا کردیتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ جس کام کا اس سے مطالبہ کیا جارہا ہے وہ درحقیقت جسمانی اعتبار سے بہت معمولی ہوتا ہے، لیکن نوجوان کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، چنانچہ اس کی پریشانی جسمانی نہیں شعوری اور جذباتی ہوتی ہے، پھر یہ کہ نوجوان اپنے والدین کے مطالبات کا انکار کرکے سرکش بھی نہیں بننا چاہتا الا یہ کہ کوئی ایسا جذباتی معاملہ ہو جو اس کو جلدی عمل کر لینے سے مانع ہو، نوعمری کے مرحلہ میں اس طرح کے بہت سے مواقع پیش آتے ہیں جن پر اس کو بڑے ہونے کے بعد خود بھی تعجب ہوتا ہے، وہ تعجب کرتا ہے کہ وہ کس طرح تردد کا شکار ہوتا تھا اور جواب دینے اور والدین کے مطالبات کو پورا کرنے میں کس قدر کوتاہی وسستی برتتا تھا اور تاخیر کرتا تھا، اکثر وبیشتر یہی دیکھا گیا ہے کہ والدین

کوشش کرتے ہیں کہ بچے سے جو مطالبہ کیا جارہا ہے وہ اسے پورا کرے، بعض لوگوں کو مثلاً اس طرح کہتے ہوئے سنا جاتا ہے: ''مجھے اس پر شدید غصہ آیا کیونکہ میں نے اس سے ایک معمولی سا کام کہا وہ بھی اس نے نہیں کیا''، ''میں نے اس سے کوئی بڑا کام تو کہا نہیں تھا بہت چھوٹے سے کام کا مطالبہ کیا تھا''، ''میں نے ہزار بار اس سے کہا مگر وہ سنتا ہی نہیں''۔

حقیقی مشکل تب پیدا ہوتی ہے جب دونوں فریق یعنی والدین اور اولاد اپنی اپنی جگہ اپنے موقف پر شدت سے قائم رہتے ہیں، پھر اس مشکل کی مدت (Duration) میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے، چنانچہ والد یہ سوچ کر اپنے مطالبہ سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹتے کہ انھوں نے ایک معمولی، معقول اور جائز مطالبہ کیا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ ان کی حیثیت و حاکمیت بطور والد مجروح ہو، جبکہ دوسری طرف نوعمر بچہ نوعمری کے مرحلہ کی شخصی خصوصیات کے سبب اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹتا، نشوونما اس مرحلہ یعنی عنفوان شباب میں اس کی مثال اس تین سالہ بچے کی ہوتی ہے جس کے اندر تین سال کی عمر میں پہلی بار بڑوں سے الگ مستقل ایک شخصیت اور آزادی کا شعور پیدا ہونے کی ابتدا ہوتی ہے، چنانچہ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بڑوں سے الگ اپنی مستقل شخصیت کو ثابت کرے اور اپنے متعلق فیصلہ لینے میں آزادی کو یقینی بنائے، یہی حال نوعمروں کا اس مرحلہ میں ہوتا ہے وہ پختہ عقل و پختہ کار بڑوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش کرتا ہے، اس کو فیصلہ لینے میں اپنے استقلال و آزادی کے احساس کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی شخصیت سازی کے لیے اس کی یہ ضرورت فطری ہوتی ہے۔

اس تفصیل کے بعد جو نکتہ سامنے آیا وہ یہ کہ وہ اس مطلوب کام کو کرنے سے عاجز نہیں ہے، بلکہ اس کو اس کام میں اس لیے دلچسپی اور اطمینان نہیں ہے کیونکہ اس کے دل میں یہ کھٹک ہے کہ جس کام کا اس سے مطالبہ کیا جارہا ہے، وہ اس کو صرف انجام دینے کا مکلّف ہے، اس میں اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے، ساتھ ہی اس کو والد کے ذریعہ دلایا جانے والا یہ احساس مزید پریشان کرتا ہے کہ اس کے متعلق فیصلہ لینے کا حق صرف انہی کو ہے، پھر وہ اس کے سبب احساس خطا میں مبتلا ہوتا ہے، کیونکہ فی الحقیقت وہ دوسروں کو بالخصوص اپنے والدین کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ سوچ کر کہ اس نے والد کا مطالبہ پورا نہیں کیا اپنے آپ پر غصہ ہوتا ہے اور ذہنی تناؤ (Frustration) کا شکار ہوتا ہے، لیکن اس سے اس کا احساسِ آزادی و استقلال پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی لیے وہ اپنے مواقف میں مزید سخت اور سرکش بن جاتا ہے، پھر وہ اس طرح تردد و پریشانی کا شکار ہوتا ہے کہ پورے طور پر اس کو یہی نہیں پتہ ہوتا کب اور کہاں اس کو مثبت جواب دینا ہے ''ہاں'' کہنا ہے اور کہاں منفی جواب دینا ہے ''نہیں'' کہنا ہے، اس کی اس کیفیت میں یہ دیکھ کر مزید اضافہ ہوتا ہے کہ اس کے والد اس کے جذبات و احساسات کو نہیں سمجھ رہے ہیں، پھر بحث و تکرار اور جدال میں اضافہ ہوتا ہے، جس قدر یہ اضافہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر معاملہ خراب اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔

اپنے نوجوان بچوں کو یقین دلانا چاہیے کہ وہ خود مختار ہیں، ان کی اپنی شخصیت ہے، ان کو آزادی حاصل ہے، وہ اپنے فیصلے لینے میں آزاد ہیں، صرف یہ یقین دلانے میں اگر آپ کامیاب ہوگئے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے انکار و عناد میں بڑی حد تک کمی آئے گی، اگر ہم جانتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں تو ہمیں اپنی آزادی کے حصول کے لیے کسی جھگڑے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نوجوان کے ساتھ جو تعلقات دن بدن بڑھتے ہیں ان میں بڑی حد تک برابری کا معاملہ ہوتا ہے، چنانچہ والد کی حیثیت ایک شریک و رفیق کی ہونا چاہیے نہ کہ ایک حاکم و مختار کی، جو صرف حکم نافذ کرتا رہے، اگر آپ اپنے نوجوان بچوں کے ان تغیرات کا اس طرح حکمت سے سامنا کریں گے تو خوشگوار تعلقات پروان چڑھیں گے اور آپ بہت سی مشکلات و

پریشانیوں سے بچ سکیں گے، اس لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ بچے کو آزادی دیجئے، اگر آپ زیادہ احکام اور حدود وقیود نافذ کریں گے تو جب بھی اس کو موقع ملے گا وہ آپ سے دور بھاگے گا، لیکن اگر آپ نے اس کو ایک باشعور جوان کی طرح برتاؤ کرنے کی آزادی دی تو گھر اور افراد خانہ کا مثبت ماحول اسے ہمیشہ روک کر رکھے گا، اگر آپ اس سے درگذر کریں گے اور بتدریج اسے اختیار وفیصلہ کی آزادی دیں گے تو گویا آپ اس کی زندگی میں بڑا اہم اور مؤثر رول ادا کریں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہمہ وقت آپ کی ضرورت محسوس کرے گا، پھر وہ آپ کو اس طرح چاہے گا گویا آپ ہی اس کے لیے ملجأ و ماوی ہوں گے، آپ کے پاس ہی اس کو امن وسکون اور اطمینان ملے گا، آپ سے ہی اس کو حوصلہ ملے گا، وہ اس صورت میں تو آپ کو پسند کرے گا، لیکن آپ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہیں تو وہ آپ کو کبھی نہیں پسند کرے گا، وہ آپ کی نصیحتوں پر توجہ دے گا، آپ کے اشارات پر کان دھرے گا لیکن وہ یہ کبھی نہیں پسند کرے گا کہ آپ اسے کچھ کرنے پر مجبور کریں، وہ آپ کی محبت اور آپ کے اہتمام کی قدر کرے گا مگر یہ کبھی نہیں برداشت کرے گا کہ آپ اس سے ایک طفل مکتب کی طرح معاملہ کریں، اس کی یہ خواہش ہوگی کہ آپ اسے اس نظر سے دیکھیں گے کہ گویا وہ سنِ رشد کے قریب پہنچنے والا ایک باشعور انسان ہے نہ کہ وہ ایک بچہ ہے جو جسمانی طور پر ذرا بڑا ہو گیا ہے، وہ چاہے گا کہ آپ کے افکار ومشاہدات سے واقف ہو، لیکن یہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ ہمیشہ آپ کی ہر فکر سے اتفاق کرے۔

ایک اور بات ضرور پیش نظر رہنا چاہیے، وہ یہ کہ آپ اس کو کبھی بھی یہ احساس نہ دلائیں کہ آپ کی زندگی اسی پر موقوف ہے، بلاشبہ وہ یہ چاہتا ہے کہ آپ اس پر اعتماد کریں، لیکن اصولی و منطقی طور پر یہ بات منصفانہ نہیں کہ خود کو آپ کا ذمہ دار سمجھے، ایسا عام طور پر تب ہوتا ہے جب والدین میں علیٰحدگی ہو جائے جو اکثر دونوں میں سے ایک کی موت سے ہو ہی جاتی ہے، اس صورت میں عام طور پر والد یا والدہ جو بھی زندہ بچتا ہے وہ ہمہ وقت بچے کے ساتھ جینا چاہتا ہے، چنانچہ جو بقید حیات رہتا ہے مثلاً والد کو لے لیجئے، وہ بچے کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ تمہاری ماں کو چھوڑ کر نہیں رہ سکتے تھے، گویا اب ان کی صحت وسلامتی اس بچے پر موقوف ہے، اس طرح والد نے بچے پر ایک بوجھ رکھ دیا کہ ہر وقت ان کے ساتھ رہے، محاورے کی زبان میں ان ہی کو پکڑ کر بیٹھا رہے، جبکہ اس کی عمر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے ہم عمروں سے ملے جلے اور ان میں کچھ دیر اٹھے بیٹھے، کبھی کبھی والد کچھ جذباتی یا جسمانی کمزوری کا اظہار اس لیے کر دیتے ہیں کہ بچے کی کچھ توجہ اور اس کی محبت ورعایت حاصل ہو جائے اور وہ کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھے۔

یہ معاملہ نوجوان کے حق میں صحیح نہیں ہے، اس کو اس سے نقصان پہنچے گا، اس لیے کہ اس کی عمر وہ نہیں جس میں اس پر بڑی بڑی ذمہ داریاں ڈالی جائیں، اس کو تو زندگی کے اس مرحلہ میں ضرورت ہے کہ وہ اپنی ذات سے واقف ہو سکے، اپنی ترجیحات و مصروفیات اور زندگی میں اس کے لیے لازمی امور کو بغیر کسی دباؤ اور بڑی ذمہ داری کے سمجھ سکے، بلاشبہ وہ اس طرح کی ذمہ داریوں کو نبھانے کا سلیقہ زندگی کے ایک موڑ پر سیکھ لے گا، جب اس کی اپنی فیملی ہوگی، اپنے بچے ہوں گے اور ذمہ داری سر پڑے گی تو وہ یہ سب سیکھ لے گا، البتہ اگر اس مرحلہ نوعمری اس کے لیے جن چیزوں کا سیکھنا ضروری ہے ان کا موقع نہ دیا گیا تو پھر عمر کا یہ مرحلہ اور یہ موقع زندگی میں کبھی دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

گھر کے کاموں میں تعاون:

اگر آپ کے بچے کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹانے کو بوجھ نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ شرکتِ عمل سکون واطمینان کا باعث ہوتی تھی، گھریلو کام محض فرض (Duty) سمجھ کر نہیں انجام دیے جاتے تھے، تو پھر غالب گمان یہ ہے کہ آپ نوعمری کے اس مرحلہ میں اس کے ساتھ اس

سلسلے کی مشکلات سے دوچار نہیں ہوں گے، اگر بچپن میں جب بھی اس کو مدد کی ضرورت ہوئی آپ نے اس کا تعاون کیا تھا تو یقیناً جب بھی آپ کو مدد کی ضرورت ہوگی وہ آپ کا تعاون کرے گا، یہ الگ بات ہے کہ عمر کے اس مرحلہ میں وہ یہ چاہے گا کہ آپ اسے حکم دینے کے بجائے اس سے تعاون کا مطالبہ کریں، اسی طرح وہ اس کو ترجیح دے گا کہ وہ جس وقت مناسب سمجھے اس وقت مطلوب کام انجام دے، بجائے اس کے کہ جس وقت آپ مطالبہ کریں بس اسی پَل دوڑ پڑے، اس کی خواہش یہ بھی ہوگی کہ اس کام کی کیفیت کے سلسلہ میں آپ اس سے مشورہ لیں، اور اس کو اسے کرنے میں آزادی دیں کہ وہ اپنے حساب سے اور اپنے طریقہ سے اس کام کو انجام دے، بجائے اس کے کہ وہ ہر وقت آپ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق اس کام کو انجام دے۔

یہ عام نفسیاتی اصول ہے، ہم سب اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جب ہماری کوششوں کی قدر افزائی کی جاتی ہے اور ان کو سراہا جاتا ہے، کام کرنے اور فیصلہ لینے کی کچھ آزادی دی جاتی ہے تو کام ہم زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دیتے ہیں، ہم میں کون ہے جو یہ پسند کرتا ہو کہ بہتر طریقہ سے کام انجام دینے کے باوجود کوئی شخص مسلط رہے اور ہمہ وقت اپنے انداز سے کام کرنے کا مطالبہ کرتا رہے خواہ اس کا طریقہ بھی ہمارے طریقہ سے بہتر نہ ہو، اس پر مستزاد یہ کہ وہ ہماری کوشش کو بھی نہ سراہے اور ہمارے احساسات کو بھی نہ سمجھے؟ ہم میں سے کون ہے جو اس رویّے کو پسند کرے گا؟

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسروں سے آپ کو بہتر نتیجہ اور رسپانس ملے اور ان کی بہترین صلاحیتیں کام میں لگیں تو غور کرنا ہوگا کہ آپ دوسروں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کر رہے ہیں، یہ اصول جس طرح ایک کارخانے میں کام کرنے والوں پر منطبق ہوتا ہے اسی طرح گھر کے افراد پر بھی منطبق ہوتا ہے، چنانچہ اگر آپ نے ڈکٹیٹر شپ والا رویّہ اپنایا تو پھر آپ کا بچہ بہت کم کام کے لیے آمادہ ہوگا، جو کچھ کرے گا وہ بھی بہت لیٹ لطیف اور ٹال مٹول سے کرے گا، کام سے فرار اختیار کرنے کے ہزار بہانے تراشے گا، جب بھی آپ چاہیں گے وہ آپ کے پاس آئے وہ آپ سے دور بھاگے گا، وہ کام سے جی چرائے گا اور اس سے جب بھی کسی کام کا مطالبہ کیا جائے گا وہ انکار کر دے گا۔

بعض والدین پوچھتے ہیں کہ اگر بچہ کام کرنے سے فرار اختیار کرتا ہے تو کیا اس کو کبھی کبھی کسی کام کے عوض کچھ پیسے دیے جاسکتے ہیں؟ قاعدہ یہ ہے کہ اگر وہ بغیر پیسے کے کام کرنے سے منع کرے تو اس کو ہرگز پیسے نہ دیجئے، اس لیے کہ اگر آپ نے یہ سلسلہ شروع کر دیا تو آپ دن بہ دن بھاؤ تاؤ کرنے اور رشوت دینے میں پھنستے جائیں گے۔

اگر بچہ کاموں میں تعاون سے انکار کرتا ہے مگر آپ کو لگتا ہے کہ اس کو کچھ نہ کچھ کام انجام دینا چاہیے، تو بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ پیسے وغیرہ دینے کے بجائے بنیادی طریقۂ علاج کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کیجئے، سب سے پہلے یہ غور کیجئے کہ جس کام کا آپ اس سے مطالبہ کر رہے ہیں وہ معقول ہے یا نہیں؟ اس کے بس میں ہے یا نہیں؟ اگر آپ کو لگتا ہے کہ ''ہے'' تو پھر اس سے مطالبہ کیجئے کہ وہ اس کام کو انجام دے، لیکن بھاؤ تاؤ میں بالکل نہ پڑیئے۔

البتہ اگر بچہ رضامندی سے کام انجام دیتا ہے، وہ کام کے بدلہ میں روپے پیسے کا مطالبہ بھی نہیں کرتا تو اس کو کبھی کبھی کچھ پیسے دینے میں کوئی حرج بھی نہیں، آپ کو جب بھی لگے کہ آپ بچے کو کچھ پیسے دیں تاکہ انھیں اپنے اوپر خرچ کرے اور لطف اندوز ہو تو آپ اسے بالکل دیجئے، مگر یہ خیال رکھیے کہ کہیں اس کے اندر ہر کام کو کرنے کے بعد پیسہ ملنے کی امید نہ جاگ جائے، بچہ اگر یہ سیکھ جائے کہ ہم جب بھی کوئی کام کریں تو اس پر ہمیں کوئی معاوضہ اور مادی فائدہ ملنا ہی چاہیے تو یہ کوئی اچھی اور حکمت کی بات نہیں ہوگی۔

بعض نوجوان یہ پسند کرتے ہیں کہ کچھ پیسے کمائیں تاکہ اس سے وہ اپنی خواہشات پوری کر سکیں، اپنے کھیل کود پر خرچ کر سکیں، چنانچہ اگر وہ اپنی رغبت سے گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتا

ہے اور پھر کبھی اپنے جیب خرچ سے زائد رقم کا مطالبہ کرتا ہے بایں طور کہ آپ اس سے متعین اجرت پر کوئی کام کرالیں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں، مثلاً وہ گھر کے صحن کی صفائی ایک متعین رقم کے بدلہ کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اس کے اندر یہ بات نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ گھر کے ہر کام کے بدلہ پیسہ ملنا ہے۔

گھر کے باہر کام:

جب بچہ عنفوان شباب کے مرحلہ میں ہوتا ہے تو اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ گھر سے باہر اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ کوئی کام کرے، جیسے کہ کسی تجارتی مرکز میں بحیثیت معاون کام کرے، اگر اس سے عام حالت میں اس طرح کا کام نہ کرایا جائے تو بھی چھٹی کے ایام میں اہل خانہ کو چاہیے کہ اس طرح کا کچھ خاص پلان کریں، اس سے بچے کو نمو میں بھی مدد ملے گی اور زندگی کو پرکھنے اور برتنے کا بھی اس کو موقع ملے گا، لوگوں سے ملنے جلنے کی عادت ڈالنے میں بھی اس کو مدد ملے گی اور اس کو یہ دیکھنے کا موقع بھی ملے گا کہ ایک انسان اپنی روزمرہ کی روزی کس طرح کماتا ہے، اسی طرح اس کو مالی امور کو سیکھنے اور مال کو استعمال کرنے کا سلیقہ سیکھنے میں بھی مدد ملے گی، اس طرح اس کا وقت بھی ایک مفید کام میں استعمال ہوگا بجائے اس کے کہ وہ خالی بیٹھا رہے اور وقت ضائع کرے، لیکن جب بچہ گھر کے باہر کام میں دلچسپی لے تو کچھ اہم امور ہیں جن پر سوچنا ضروری ہوتا ہے، ان میں سے ایک تو کام کی کیفیت ونوعیت ہے، دوسرے یہ کہ بچہ اس کام کو انجام دینے پر قادر ہوگا کہ نہیں، کن لوگوں کے ساتھ وہ کام کرے گا اور کن لوگوں کے ساتھ اس کا گھلنا ملنا ہوگا، آنے جانے کی کیا نوعیت ہوگی، گھر سے جانے اور آنے کے کیا اوقات ہوں گے، بچہ جب پہلی مرتبہ کام کے لیے جائے تو مفید ہوگا کہ والد بھی ساتھ جائیں تاکہ وہ لوگوں سے متعارف کرادیں اور کام بھی سمجھا دیں، والد بچے کی اس طرح بھی مدد کرسکتے ہیں کہ اس سے کہیں کہ وہ صاحب معاملہ سے اپنا تعارف خود کرائے اور خود والد اس سے پہلے وہ خود اپنا تعارف کرادیں، یہ بات تو بہرحال ذہن میں ہونا چاہیے (Under Stood) کہ یہ کام کسی طرح بھی اس کی پڑھائی پر اثر انداز نہ ہو، نہ وقت کے اعتبار سے اور نہ محنت کے اعتبار سے، والد کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس کام میں ان کا کردار (Role) مثلاً ٹرانسپورٹ وغیرہ کے سلسلہ میں بالکل واضح ہو، ایسا نہ ہو کہ جس کام کو انجام دینے کی ان کے پاس فرصت نہ ہو، بچہ اسی کی ان سے توقع کرے، ابتدا ہی میں اگر اس سلسلہ میں بچے سے صاف اور واضح انداز میں معاہدہ کرلیا جائے تو آئندہ پیش آنے والی بہت سی مشکلات سے بچا جاسکتا ہے۔

میں ذاتی طور پر آپ کو بتاتا ہوں کہ جب میرا ایک بیٹا ۱۴/ سال کا ہوگیا تو میں نے اپنی اہلیہ سے بات کرنے کے بعد اپنے ایک دوست سے اس کے لیے بات کی، جن کی گھریلو ضروریات کے سامان کی ایک دکان تھی، اسکول کی دو ہفتہ کی چھٹی میں سے ایک ہفتہ اس نے وہاں کام کیا، اس ایک ہفتہ میں اس نے عملی زندگی سے متعلق بہت کچھ سیکھ لیا، اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا، مختلف لوگوں سے ملنے جلنے کا سلیقہ سیکھا، صاحب معاملہ (دکان کے مالک) سے تعامل کا طریقہ سیکھا، پہلے دن میں ساتھ گیا اور اس کو اپنے دوست کے سامنے پیش کردیا، انھوں نے اس کو کام کی نوعیت وتفصیل بتادی، پہلے دن میرے بیٹے کے ساتھ یہ لطیفہ بھی پیش آیا کہ اس کو اس وقت کام کا تجربہ بھی نہیں تھا اور پھر وہ کام میں مشغول بھی بہت رہا، اس کے سبب اس نے دن بھر نہ کچھ کھایا نہ پیا، شام کو بھوکا پیاسا گھر واپس آیا، لیکن دوسرے ہی دن اس نے اپنے وقت کو تقسیم کر کے کاموں کو ترتیب سے کرنا سیکھ لیا، کام کے ساتھ ساتھ اچھی غذائیت بھی اس کے لیے ضروری ہوتی ہے جو اس کو تسلسل کے ساتھ کام کرنے میں تقویت پہنچا سکے، ہفتہ کے اختتام پر باوجود شدید تھکن کے وہ اس نئے تجربہ سے بہت خوش تھا، بلکہ اس محنت اور عرق ریزی کے سبب اس نے جو چھوٹی سی رقم حاصل کی اس پر فخر کررہا تھا۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

ماحول کے ڈر سے آنے والی تبدیلی عارضی ہوتی ہے

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپ گڑھ

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی رح کا شمار دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے انتہائی قابل اور لائق افراد میں ہوتا ہے۔ ندوہ کو اپنے جن سپوتوں پر ناز ہے، ان میں ایک نام مولانا قدوائی صاحب کا بھی ہے۔ وہ اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز، تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کے ماہر تھے، علوم دینیہ اور تاریخ واقتصادیات پر اچھی نظر تھی۔ انہوں نے ندوہ میں اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زیادہ تر ان ہی مضامین کو پڑھایا۔ تاریخ ہند اور تاریخ اسلام ان کا ذاتی ذوق تھا۔

مولانا استاد و معلم کے ساتھ بہترین نگراں اور مربی بھی تھے۔ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں ان کا اپنا مخصوص رجحان، نظریہ اور سوچ تھی۔ بقول حضرت مولانا علی میاں ندوی رح مولانا کی طبیعت چونکہ بڑی بے ہمہ باہمہ واقع ہوئی تھی، ان میں بڑی بے تکلفی و سادگی تھی، طلبہ پر شفقت ان کے ذاتی معاملات سے بھی دلچسپی و ہمدردی اور ان کے ساتھ مساوات کا معاملہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، وہ ضوابط واحکام اور سرزنش و تعزیر سے زیادہ افہام وتفہیم اور نصیحت وتلقین کی افادیت پر یقین رکھتے تھے اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں محبت و ہمدردی اور اخلاق کے اثر کے قائل تھے۔ اس لئے طلبہ ان سے سب سے زیادہ مانوس اور قریب ہو گئے۔ (پرانے چراغ ۸۸۲/۲)

مولانا ندوہ میں صرف درجہ کے استاد نہیں تھے بلکہ وہ طلبہ کے نگراں واتالیق اور علمی ترقی کے مشیر ورہنما تھے اور طلبہ کی انجمن الاصلاح کے وہ دوران طالب علمی ناظم بھی رہ چکے تھے۔ اس لئے انجمن الاصلاح کی افادیت کے بہت قائل اور معترف تھے اور طلبہ کو اس سے مربوط رہنے اور کما حقہ فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتے اور اس کی تاکید کرتے تھے۔

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی رح کے اندر وسعت مطالعہ اور علوم کے توسع نے ایک خاص اعتدال اور ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ وہ واقعی قدیم وجدید کے نمائندے تھے۔

نگرانی اور اتالیقی کے سلسلہ میں مولانا کا ایک خاص اسلوب اور انداز تھا ۱۹۴۰ء کی دہائی میں مولانا قدوائی ندوہ میں تاریخ و دینیات اور اقتصادیات کے استاد تھے اور ساتھ ہی رواق شبلی کے نگراں بھی تھے، اس زمانہ کے جن طلبہ نے آپ کی نگرانی میں رہ کر دنیائے عالم میں اپنا نام کمایا، ان میں مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ بھی تھے۔ مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ آپ کی نگرانی اور انداز تربیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا جب تک دار الاقاموں کے نگراں رہے ان کا اصول تربیت یہ تھا کہ طلبہ کو بات بات پر ٹوکنے اور قدم قدم پر دار و گیر کرنے کے بجائے ان کے ضمیر کو بیدار کریں۔ ان کے

اندر احساس ذمہ داری پیدا کریں اور ''اپنا کام آپ کرو'' کے راستے پر لگائیں، چنانچہ مولانا نے اپنے دور نگرانی میں طلبہ کی ایک کمیٹی بنا دی تھی جو اپنا نقیب منتخب کرتی تھی۔ نقیب ہر ماہ بدلا جایا کرتا تھا تا کہ ایک طالب علم انتظامی ذمہ داریوں میں الجھ کر تعلیم سے غافل نہ ہو جائے، یہ نقیب نگراں اعلی کے ماتحت خود مختار ہوتے۔ طلبہ کو احاطہ دار العلوم سے باہر جانے کا پروانہ دیتے۔ بیمار طلبہ کی تیمار داری کرتے اور علاج کا بندوبست کرتے۔ اور نمازوں کے لئے خاص طور پر فجر کی نماز کے لئے اپنے ساتھیوں کو اٹھایا کرتے۔ طلبہ مولانا سے بہت قریب تھے اور ان کا دل سے احترام کرتے اور ان کو صرف ''مولانا'' کے لفظ سے یاد کرتے، مولانا سے ہر طرح کے مشورے لیتے، اپنی تعلیم و مطالعہ سے متعلق ہدایات لیتے اور بسا اوقات اپنے نجی معاملات میں بھی مشورہ اور رہنمائی حاصل کرتے، مولانا ایک سخت گیر اور خوردہ گیر نگراں نہیں بلکہ ان کو باپ یا بڑے بھائی کے مرتبہ کا انسان سمجھتے۔ مولانا کا معاملہ یہ تھا کہ خود تو انتہائی متشرع تھے، کبھی مشتبہ یا مباح امر کی طرف بھی مائل نہیں ہوئے مگر طلبہ کے حق میں چشم پوشی سے کام لیتے۔ ان کے بعض رفقاء کو ان کے اس طرز عمل پر اعتراض تھا کہ اپنی ذات سے تو زہد و تقوی کے ہر معیار پر کامل ہیں مگر طلبہ کی تساہلی برداشت کرتے ہیں، ان کے خلاف کوئی سرزنش کی تجویز پیش نہیں کرتے۔ بلکہ نرم خوئی سے مسلمانوں کے رواجی وضع اختیار کرنے کی ہدایت کرتے۔ ان کا خیال تھا جو صحیح ثابت ہوا کہ جو طلبہ آج آزاد نظر آتے ہیں جب ان کا ضمیر جاگے گا اور ضرور جاگے گا تو پھر ان کے اندر تبدیلی آجائے گی، ماحول کے ڈر سے جو تبدیلی اختیار کریں گے وہ عارضی ہوگی۔ (سہہ ماہی کاروان ادب اپریل۔ جون ۱۹۹۶ء مضمون یاد یار مہرباں از عبداللہ عباس ندوی رح)

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی رح کے اس انداز نگرانی اور اتالیقی کو اختیار کرنے کی مدارس و مکاتب میں بہت ضرورت ہے۔ طلبہ پر سوار ہو کر اور سختی کر کے کام کروانا یہ وقتی طور پر تو ٹھیک ہے لیکن اس کا فائدہ تادیر اور پائدار نہیں ہوتا۔

آج مدارس میں، (خاص طور پر اقامتی مدارس اور اداروں میں) طلبہ کی نگرانی کے سلسلہ میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، یا تو طلبہ پر اس قدر سختی کی جاتی ہے کہ وہ احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں جرآت و ہمت شجاعت و بہادری اور حق گوئی کے اوصاف سے وہ زیادہ تر محروم ہو جاتے ہیں۔ دوران طالب علمی نگراں اور اساتذہ و ذمہ داران اس قدر دبا کر رکھتے ہیں کہ ان کے اندر سے خودی اور خودداری کے اوصاف مردہ ہو جاتے ہیں۔ طالب علم کی حق بات اور درست موقف کو بھی سختی سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ حکمت و دانائی کی بات ہے کہ ان کے مسائل بھی سنا جائے اور جائز حد تک ان کی ضرورتوں پر توجہ دی جائے اور مسائل حل کئے جائیں۔

دوسری طرف بعض اداروں میں اظہار رائے اور فطری آزادی کے نام پر اتنی چھوٹ اور رعایت دی جاتی ہے، اور اس قدر چشم پوشی سے کام لیا جاتا ہے کہ طلبہ وضع و قطع میں تو آزاد ہو ہی جاتے ہیں فرائض اور جماعت کی نمازوں میں حاضری بھی بہت کم رہتی ہے یہ صورت حال تو پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ طلبہ آزاد خیال و آزاد منش ہو جاتے ہیں، بے راہ روی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے تربیت افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کی راہ میں ہو تو وہ اصول تربیت اور وہ نگرانی و اتالیقی کامیاب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سیرت طیبہ میں اصول تربیت کے سلسلہ میں بھرپور رہنمائی ملتی ہے، اور کس حد تک سختی کی جائے اور اس کا طریقہ اور انداز کیا ہو؟ نیز کس قدر رعایت اور چشم پوشی کی گنجائش ہے، اس کی مثالیں اور نمونے بھی کثرت سے موجود ہیں۔

☆☆☆

❑ موجودہ منظرنامہ

یہ آزادی بچانے کی لڑائی ہے

ڈاکٹر محمد منظور عالم
(آل انڈیا ملی کونسل)

پورا ہندوستان آزادی کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ ہر شہر، ہر قریہ اور ہر قصبہ میں عوام سڑکوں پر ہے۔ آزادی کا مطالبہ کررہے ہیں۔ آج کا ہندوستان 1857 کے بعد انگریزوں کے خلاف شروع ہونے والی جدوجہد کی عکاسی کررہا ہے۔ جس طرح اس دور میں سبھی ہندو مسلم سکھ عیسائی، دلت آدی واسی آزادی کی تحریک چلارہے تھے۔ انگریزوں کے خلاف متحد ہوکر آزادی کا نعرہ بلند کررہے تھے اسی طرح آج بھی پورا ہندوستان متحد ہوکر آزادی کا نعرہ بلند کررہا ہے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی سڑکوں پر اتر کر آزادی کی مانگ کررہے ہیں۔ لڑائی دونوں ایک جیسی ہیں۔ تحریک یکساں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ 1857 میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی تھی۔ اس تحریک اور جدوجہد کا مقصد ملک کو غیروں سے نجات دلانا تھا۔ بیرونی طاقتوں کو ملک بدر کرنا مقصد تھا۔ آج کی لڑائی کا تعلق آئین اور دستور کے تحفظ سے ہے۔ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں کامیابی ملنے کے بعد جس ہندوستان کی تعمیر اور تشکیل ہوئی تھی، اسے باقی رکھنے کی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندوستان پھر خطرے میں پڑ گیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی اس کا آئین، دستور اور جمہوری اصول ہے۔ ان چیزوں کو ایک گروپ اور ارباب اقتدار ختم کرنے کے درپے ہیں اور اس کا آغاز وہ کرچکے ہیں۔ شہریت ترمیمی قانون ہندوستان کے آئین کے خلاف ہے اور اسے ہندو راشٹر بنانے کی طرف بنیادی قدم ہے۔ منواسمرتی یعنی آقا اور غلام جیسا نظام تھوپنے کا یہ منصوبہ ہے۔ اس لئے یہ لڑائی یقینی طور پر آزادی کی لڑائی ہے۔ ملک اور دستور کو بچانے کی لڑائی ہے۔ یہی جذبہ ہے جس کی بنیاد پر پورا ملک سراپا احتجاج بن گیا ہے۔ ملت ٹائمز کی رپوٹ کے مطابق ہندوستان کے 140 شہر اور قصبے شاہین باغ بن چکے ہیں یعنی دہلی کے شاہین باغ کی طرح وہاں دن رات لگاتار متنازع شہریت قانون، این آرسی اور این پی آر کے خلاف احتجاج ہورہا ہے۔ مردوں کے ساتھ خواتین سرفہرست ہیں اور وہ قیادت کررہی ہیں۔ اس کے علاوہ دسیوں مقام پر روزانہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ سڑکوں پر اتر کر احتجاج کررہے ہیں، پروٹیسٹ کررہے ہیں اور دستور بچانے کی جدوجہد میں پیش پیش ہیں۔

آزادی ایک عظیم دولت اور بہت بڑی نعمت ہے۔ آزادی کی اہمیت، اس کی قدر و قیمت ان سے معلوم کیجئے جو محکوم ہیں، جنہوں نے آزادی کا دور نہیں دیکھا ہے۔ ہندوستان کی آزادی ایک طویل جدوجہد کی بعد حاصل ہوئی تھی۔

جمہوریت اور سیکولرزم آزاد ہندوستان کی روح ہے۔ اس کے بغیر آزادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج کے ماحول میں یقینی طور پر ایک طبقہ ہندوستان اور یہاں کے عوام سے آزادی سلب کرنا چاہتا ہے۔ اسی منصوبہ پر وہ عمل پیرا ہے اور اس منصوبہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بابا بھیم راؤ امبیڈکر کا تشکیل کردہ دستور ہے۔ دستور ہندوستان کی اصل طاقت، سیکولرزم کی شناخت اور پہچان ہے۔ آر ایس ایس اور بی جے پی اسی دستور کو بدلنا چاہتی ہے۔ متنازع شہریت قانون اسی مہم کا ایک حصہ ہے جس میں شہریت کی بنیاد تاریخ پیدائش ہے۔ یہ نسل پرستی، تعصب اور دیگر مذاہب کے خلاف قانون ہے۔ جمہوریت اور ڈیموکریسی کی روح کے خلاف ہے۔ آئین میں یہ ترمیم ہندوستان کو دوبارہ غلام بنانے اور آمریت نافذ کرنے کے مترادف ہے۔ قابل مبارکباد ہندوستان کے عوام ہیں جنہوں نے اس حقیقت کو بہت جلد سمجھ لیا۔ جیسے ہی آئین میں یہ ترمیم ہوئی وہ سڑکوں پر نکل پڑے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ملک کی دیگر یونیورسٹیز کے اسٹوڈینٹ پہلے سڑکوں پر نکلے اور پھر پورے ہندوستان نے اس کا ادارک کرلیا کہ یہ قانون دستور کی بنیاد کے خلاف ہے۔ ملک کو دوبارہ غلام بنانے کی سازش ہے۔ برہمنواد کا نظام تھوپنے کا عملی منصوبہ ہے۔ دلتوں کو پھر غلام بنایا جائے گا۔ آدی واسیوں سے انسانی حقوق سلب کرلئے جائیں گے اور مسلمانوں، عیسائیوں کو پریشان کیا جائے گا۔ غریبوں کو انسانی حق سے محروم کرکے بندھوا مزدوروں کی طرح جینے پر مجبور کردیا جائے گا۔ اگر ایسا ہی رہا تو آنے والا کل بہت خطرناک، بھیانک اور تاریک ہوگا لیکن ایسا ہو نہیں پائے گا کیوں کہ بھارت کے عوام بیدار، متحد اور آر ایس ایس کے خطرناک عزائم سے آگاہ ہیں۔ سڑکوں پر نکل کر تحریک چلانا ان کی اسی بیداری کی علامت ہے اور یقینی طور پر یہ ایک نئی آزادی کی لڑائی ہے۔ آزادی بچانے اور آزادی برقرار رکھنے کی لڑائی ہے۔

آزادی ایک عظیم نعمت ہے۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ آزادی اس کا بنیادی حق ہے لیکن ملک میں ایسا گروہ کئی سو سالوں سے سرگرم ہے جو انسانوں کو غلام بنانا چاہتا ہے اور گذشتہ چند سالوں سے اقتدار مل جانے کے بعد یہ گروہ اسے عملی جامہ پہنانے کیلئے مکمل منصوبہ بندی میں لگا ہوا ہے۔ متنازع شہریت ترمیمی قانون اور آئین آرسی لانے کا بنیادی مقصد آزادی سلب کرنا ہے اور ایک مرتبہ پھر دلتوں، آدی واسیوں اور کمزور طبقات کو بنیادی حقوق سے محروم کرنا ہے۔ آر ایس ایس اور برہمنواد کو دلتوں، آدی واسیوں اور کمزور طبقات کی آزادی، ترقی بھی منظور نہیں ہوئی ہے۔ صدیوں انہوں نے غلام بنائے رکھا ہے اور ایک مرتبہ پھر اسی نظام کو لانے کی کوشش ہورہی ہے۔ یہ قوانین اور اقدامات اس کی پہلی کڑی ہیں۔

دنیا کی تاریخ کا یہ پہلا موقع ہے جب اتنی بڑی تعداد میں خواتین سڑکوں پر اتر کر احتجاج کررہی ہیں اور کسی ملک کے آئین اور دستور کو بچانے کیلئے شب و روز ایک کرچکی ہیں۔ خواتین جب بھی سڑکوں پر اتری ہیں انہیں کامیابی ملی ہے۔ آج کی خواتین بھی کامیابی سے ہم کنار ہوں گی۔ ان کی جدوجہد کامیاب ہوگی اور آزادی کو بچانے کی یہ تحریک کامیابی سے ہم کنار ہوگی۔

آزادی صرف بیرونی تسلط کے خلاف جنگ کرنے کا نام نہیں ہے۔ آزادی صرف انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کا نام نہیں ہے۔ غربت کے خلاف جنگ بھی آزادی ہے۔ جہالت کے خلاف جنگ بھی آزادی کی لڑائی ہے۔ دستور کی حفاظت کی جنگ بھی آزادی کی لڑائی ہے۔ آئین کے حملہ آوروں کو روکنا بھی آزادی کی لڑائی ہے اور یہی آزادی آج کے دور میں مطلوب ہے۔

☆☆☆

❑ موجودہ منظر نامہ

شہریت ترمیمی قانون؛ مسلمان کیا کریں؟

عبدالرشید طلحہ نعمانی

شہریت ترمیمی قانون اور این آر سی سے متعلق ملک بھر میں احتجاج ومظاہروں کی جو انقلابی صورت حال سامنے آرہی ہے، وہ ہم سب کے لیے عیاں راچہ بیاں کی مصداق ہے۔ یوں تو آئے دن این آر سی اور سی اے اے کے حوالے سے مختلف دانشوروں کے بیانات سننے اور تحریریں پڑھنے کا موقع ملتا رہتا ہے؛ مگر گذشتہ ہفتے صوبۂ کرناٹک کے ضلع ٹمکور سے تعلق رکھنے والے محترم مولانا محمد خالد بیگ ندوی صاحب (جو ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ ملکی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور وسیع پیمانے پر اسلامی مزاج کے ساتھ عصری اسکولس قائم کرنے اور چلانے کی تحریک سے وابستہ ہیں) بعض مقامی علماء کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لائے اور علماء ودانشوران کے بڑے مجمع سے مختلف مقامات پر پاور پوائنٹ پریزنٹیشن کے ذریعہ تفصیل کے ساتھ مدلل گفتگو فرمائی، الحمدللہ سارے ہی پروگرام توقع کے مطابق کامیابی سے ہم کنار ہوئے، بالخصوص این آر سی کے سلسلے میں بہت سے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں تھیں ان کا ازالہ ہوا اور آئندہ کے لیے کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ اس پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی۔ زیر نظر تحریر میں مولانا محترم کی گفتگو کو افادۂ عام کے لیے قدرے ترمیم وتفصیل کے ساتھ تحریر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ جب ہمارا ملک برطانوی تسلط سے آزاد ہوا تو اس کے کچھ ہی عرصے بعد تقسیم کا ناگوار سانحہ پیش آیا، اور مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد ہجرت کرکے پاکستان چلی گئی۔ چوں کہ 1924ء میں آر ایس ایس کی بنیاد رکھی جا چکی تھی؛ اس لیے تقسیم کے نازک موقع پر تعصب پسند ہندوؤں کی جانب سے پورے شدومد کے ساتھ یہ آواز اٹھائی گئی کہ مسلمانوں نے اپنے لیے الگ ملک بنالیا ہے؛ لہٰذا بھارت اب ہندوراشٹر ہوگا۔ اس وقت گاندھی جی اور دیگر جمہوریت پسند رہنماؤں نے اس کی سختی سے مذمت کی اور ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کی سربراہی میں مختلف مذاہب کے نمائندوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا دستور مرتب کیا گیا جو انصاف، مروت اور مساوات پر مبنی تھا۔

گاندھی جی کی حیثیت باشندگان وطن کے درمیان مہاتما کی تھی اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے نقیب سمجھے جاتے تھے؛ اس لیے انہیں ایک سازش کے تحت قتل کرنے کا پلان بنایا گیا اور ایسا کھیل کھیلا گیا کہ گاندھی جی کو قتل تو آر ایس ایس کرے؛ مگر تہمت مسلمانوں کے سر آئے، اس طرح مسلم اقلیت تمام باشندگان وطن کے عتاب کا شکار ہوجائے اور مسلمانوں کو ملک بدر ہونے پر مجبور کیا جاسکے۔ چناں چہ اس کام کے لیے گوڈسے کو تیار کیا گیا اور اس کے ایک ہاتھ پر محمد سلیم گودوایا گیا اس نے پوری تیاری کے ساتھ گاندھی جی کو شوٹ کرنے کا پروگرام بنایا اور موقع پا کر کام تمام کردیا۔ اس کے فوراً بعد یہ افواہ عام کردی گئی کہ ایک مسلمان شخص محمد سلیم نے گاندھی جی کو قتل کردیا۔ اس سانحے کے بعد عوام کی بڑی تعداد بپھر گئی اور ممبئی میں ہندو

مسلم فساد شروع ہوا۔ ادھر ہمارے قائدین شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے فوری حرکت کی اور اعلی پیمانے پر تحقیقات کا آغاز کیا پھر مسئلہ کی تہہ تک رسائی کے بعد صرف دو گھنٹوں کے اندر اندر سردار پٹیل کے ذریعہ اس بات کا اعلان کروایا گیا کہ گاندھی جی کا قاتل مسلمان نہیں تھا؛ بل کہ آر ایس ایس کا نمائندہ گوڈسے تھا۔ جوں ہی اعلان ہوا غیظ وغضب کا سارا رخ آر ایس ایس کی طرف ہوگیا۔ اس طرح ایک بنا بنایا منصوبہ خاک آلود ہوگیا اور ہندو راشٹر کا جو خواب دیکھا گیا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ آر ایس ایس کی اس شکست فاش کے بعد 19 افراد پر مشتمل ایک خفیہ میٹینگ بلائی گئی؛ جس میں آئندہ کے لیے نظام العمل ترتیب دیا گیا، جملہ شرکاء نے اس بات پر قسم کھائی کہ ہم تعلیم کے لیے اپنی زندگی وقف کردیں گے؛ کیوں کہ تعلیم ہی ایک ایسی راہ ہے جس کے ذریعہ بڑے پیمانے پر ذہن سازی کا کام کیا جاسکتا ہے اور کئی غیر ہندو اقوام کو ہندو باور کرایا جاسکتا ہے، اس نصب العین کے مطابق کام کا آغاز ہوا اور گورکھپور سمیت ملک بھر میں اسکولس کا قیام عمل میں آیا۔ جب بات آر ایس ایس کی نکل پڑی تو برسبیل تذکرہ چند اور حقائق بھی ملاحظہ فرمائیں!

آر ایس ایس ایک خفیہ تحریک:

جناب عبدالغفور نورانی صاحب ایک اچھے قانون داں، معروف دانشور اور بے باک قلم کار ہیں۔ پچھلے چند سالوں سے آر ایس ایس کی تشدد پسند ذہنیت کو عیاں کرنے والوں میں آپ کا نام سرفہرست ہے۔ حال ہی میں اس 'پراسرار' سمجھی جانے والی تحریک پر آپ کے اشہب قلم سے انگریزی میں ایک معرکۃ الآرا کتاب شائع ہوکر داد تحسین حاصل کرچکی ہے۔ یہ کتاب اپنے اندر آر ایس ایس کے تعلق سے مختلف اہم اور بنیادی معلومات کا ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ درج ذیل اقتباس ان ہی کی ریسرچ کا خلاصہ ہے۔

آر ایس ایس کی تقریباً 100 سے زائد شاخیں ہیں، جو الگ الگ میدانوں میں سرگرم ہیں۔ جیسا کہ سیاسی میدان میں بی جے پی، حفاظت یا سکیورٹی کے لیے بجرنگ دل، مزدوروں یا ورکروں کے لیے بھارتیہ مزدور سنگھ، دانشوروں کے لیے وچار منچ، غرض کہ سوسائٹی کے ہر طبقہ کی رہنمائی کے لیے کوئی نہ کوئی تنظیم ہے۔ حتیٰ کہ پچھلے کچھ عرصہ سے آر ایس ایس نے مسلم راشٹریہ منچ اور جماعت علماء نامی دو تنظیمیں قائم کرکے انہیں مسلمانوں میں کام کرنے کے لیے مختص کیا ہے۔ پچھلے انتخابات کے دوران یہ تنظیمیں کشمیر میں خاصی سرگرم تھیں۔ ان سبھی تنظیموں کے لیے آر ایس ایس کیڈر بنانے کا کام کرتی ہے، اور ان کے لئے اسکولوں اور کالجوں سے ہی طالب علموں کی مقامی شاکھاؤں کے ذریعے ذہن سازی کی جاتی ہے۔ آر ایس ایس ہندوستان کے 88 فیصد بلاک میں اپنی شاکھاؤں کے ذریعے رسائی حاصل کرچکا ہے۔

قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ایک سال میں آر ایس ایس نے 113421 تربیت یافتہ سوئم سیوک سنگھ تیار کیے ہیں۔ ہندوستان سے باہر ان کی کل 39 ممالک میں شاکھائیں ہیں۔ یہ شاکھائیں ہندو سوئم سیوک سنگھ کے نام سے کام رہی ہیں۔ ہندوستان سے باہر آر ایس ایس کی سب سے زیادہ شاکھائیں نیپال میں ہیں۔ اس کے بعد امریکہ میں اس کی شاکھاؤں کی تعداد 146 ہے۔ برطانیہ میں 84 شاکھائیں ہیں۔ آر ایس ایس کینیا کے اندر بھی کافی مضبوط حالت میں ہے۔ کینیا کی شاکھاؤں کا دائرہ کار پڑوسی ممالک تنزانیہ 'یوگانڈا' ماریشش اور جنوبی افریقہ تک پھیلا ہوا ہے اور وہ ان ممالک کے ہندوؤں پر بھی اثر انداز ہورہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ ان کی پانچ شاکھائیں مشرق وسطی کے مسلم ممالک میں بھی ہیں۔ چوں کہ عرب ممالک میں جماعتی اور گروہی سرگرمیوں کی کھلی اجازت نہیں ہے اس لئے وہاں کی شاکھائیں خفیہ طریقے سے گھروں تک محدود ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ بابری مسجد کی مسماری اور رام مندر کی تعمیر کے لیے سب سے زیادہ چندہ ان ہی ممالک سے آیا تھا۔ فن لینڈ میں ایک الکٹرانک شاکھا ہے جہاں ویڈیو کیمرے کے ذریعے بیس ممالک کے افراد جمع ہوتے ہیں۔ یہ ممالک وہ ہیں جہاں پر آر ایس ایس کی باضابطہ شاکھا

موجود نہیں ہے۔

ان سب تفصیلات کو ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کی پیہم کامیابیوں کے پیچھے آر ایس ایس کی مسلسل جدوجہد اور انتھک محنت کارفرما ہے؛ یہی وجہ کہ آج ہر اہم اور بڑے عہدے پر ان ہی کے پروردہ افراد براجمان ہیں، جس کے خوف ناک نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ نیز یہ ہمارے لیے جائے عبرت و احتساب ہے کہ مضبوط منصوبہ بندی اور عزم و استقلال کے سبب مٹھی بھر برہمن محض پروپیگنڈوں کی بنیاد پر ملک بھر میں تباہی مچا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ سیکولر قوموں کی کثرت کے باوجود مقصد و ہدف کو متعین نہ کرنے اور زمینی سطح پر کام کو فروغ نہ دینے کے سبب آپسی انتشار کا شکار اور ذلت و پستی سے دوچار ہیں۔

کچھ باتیں سی اے اے کے حوالے سے:

یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہیے کہ ملک کے دستور کا نفاذ 1950ء میں عمل میں آیا اور دستور میں شہریت کے حوالے سے جو دفعہ مرتب کی گئی ابتداً اس میں کافی لچک رکھی گئی، پھر بعد میں موقع اور حالات کے لحاظ سے ترمیمات اور وضاحتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلی ترمیم 1986ء میں ہوئی۔ دوسری ترمیم 1992ء میں ہوئی۔ تیسری ترمیم 2003ء اور چوتھی ترمیم 2005ء میں ہوئی۔ اس وقت شہریت کے سلسلہ جو متنازع ترمیم پاس کرائی گئی اور جس کے فوری بعد ملک بھر میں مخالفت و احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں وہ اس حوالے سے ہونے والے پانچویں ترمیم ہے۔ مذکورہ ترمیم کی رو سے تین پڑوسی اسلامی ممالک؛ پاکستان، افغانستان، اور بنگلہ دیش سے غیر قانونی طور پر رہائش پذیر افراد اگر ہندو، سکھ، عیسائی، جین، بدھسٹ اور پارسی ہیں تو ان کو 'این آر سی' میں ہندوستانی شہری تسلیم کرکے شامل کرلیا جائے گا، اور اگر مسلمان ہیں تو نہیں!۔ اس طرح یہ قانون جو فی الوقت عدالتِ عالیہ میں زیرِ غور ہے' عام دانشوروں کی رائے میں دستورِ ہند کی اہم اور حساس آئینی شقوں کے خلاف ہے، اور اس سے ملک کی سیکولر حیثیت ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ایک غور طلب پہلو یہ ہے کہ کیا ہمارے احتجاج کا صرف یہی ایک سبب ہے کہ اس ترمیم میں مہاجرین کی فہرست سے مسلمانوں کو علیحدہ رکھا گیا اور ان کے ساتھ سوتیلا رویہ برتا گیا..... یا کچھ اور بھی؟؟

اس کو سمجھنے کے لیے یہ بات سمجھیں کہ آئین کی رو سے کسی بھی شہری کو شہریت دینے کی چار بنیادیں ہیں۔ 1: ولادت، 2: وراثت، 3: رجسٹریشن، 4: نیچرلزیشن۔

ان چاروں میں ابتدائی دو بنیادیں تو واضح ہیں، البتہ اخیر کی دو بنیادوں کو سمجھنے اور فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی غیر ملکی شخص اپنے ملک میں ہونے والے ظلم و جبر سے بچنے کے لیے ہمارے ملک میں آ گیا ہو یا ہمارا ملک اسے پسند ہو اور وہ یہاں رہنے کا خواہاں ہو نیز اس کے آباء واجداد میں سے کوئی ہندوستانی بھی رہے ہوں تو اس کو حکومت پہلے سات سال تک عارضی طور پر ویزا جاری کرکے قیام کی اجازت دے گی، اس دوران اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے گی، سات سال بعد وہ مزید رہنا چاہتا ہے تو اس کے مطالبے پر جو شہریت اسے دی جائے گی اسے رجسٹریشن کی بنیاد پر شہریت کہا جائے گا۔ چوتھی صورت بھی اسی کے قریب قریب ہے یعنی یہ شہریت بھی غیر ملکی کو ملے گی بس فرق اتنا ہے کہ اگر وہ غیر ملکی ہمارے ملک میں غیر قانونی طور پر رہ گیا ہو اور اس کے آباء واجداد میں سے کوئی بھی اس ملک کے نہ ہوں تو حکومت گیارہ سال تک عارضی طور پر ویزا جاری کرکے قیام کی اجازت دے گی پھر اطمینان کے بعد اس غیر ملکی کے مطالبے پر جو شہریت دی جائے گی اسے نیچرلزیشن کہا جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب پہلے سے یہ سب قوانین بنے ہوئے ہیں اور اسی بنیاد پر شہریت دینے کا سلسلہ بھی جاری ہے تو پھر سی اے اے کا کیا مطلب ہے؟ اس کو لانے کے کیا مقاصد ہیں؟ اور اس پر اصرار کی کیا وجوہات ہیں؟

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حکومت اس کے ذریعہ صرف

مسلمانوں کا چہرہ سامنے لاکر دوسری اقوام کو طفلی تسلی دینا اور خواب خرگوش میں مست رکھنا چاہتی ہے؛ تاکہ یہ مسئلہ ہندو مسلم بن کر رہ جائے اور ملک فسادات کی بھینٹ چڑھ جائے، پھر آزادی کے وقت جو منصوبہ بھارت کو ہندو راشٹر بنانے کا ہوا تھا اس کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا جاسکے۔ یاد رکھیں! آگے چل کر اگر این آر سی لاگو ہوجاتی ہے تو سب سے پہلے غیر مسلم اقوام ہی کو غیر ملکی مانا جائے گا اور سی اے اے کے ذریعہ دلت، سکھ، جین اور پارسیوں کو یہ قبول کرنا پڑے گا کہ ہم ہندو ہیں اور فلاں ملک سے قانونی یا غیر قانونی طور پر آئے ہوئے ہیں، اس طرح ان دلتوں اور آدی واسیوں کو ہندو دھرم قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا اور برہمنوں کی طرح انہیں حقوق ومراعات حاصل نہیں ہوں گی۔

ہمارے لیے لائحہ عمل:

ہمیں احتجاج کی موجودہ حرارت کو مزید تیز کرنے اور ملک بھر میں منظّم طور پر اس فضا کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ہمارے احتجاج کا عنوان ظلم سے مقابلہ اور فسطائی نظام کا خاتمہ ہے؛ اس لیے اس کو ہرگز ہندو مسلم مسئلہ نہ بننے دیں، اور اس کے لیے مسلمان اپنے ساتھ دلتوں، آدی واسیوں اور سیکولر قوموں کو لے کر آگے بڑھیں؛ بل کہ قیادت کی کمان ان ہی افراد کے سپرد کردیں۔ اب تک سیکولر قوموں کے صرف لیڈران ہمارے پروگراموں میں بہ حیثیت مہمان شریک ہوتے رہے اور ساتھ نبھانے کا تیقن دیتے رہے؛ مگر اب ضرورت ہے ایسی ملک گیر تحریک کی جس میں ساری برہمن مخالف عوام منظر عام پر آئے اور اپنا احتجاج درج کرائے۔ اگر ایسا ہو (اور خدا کرے کہ ایسا ہی ہو) تو امید ہے کہ بہت جلد اس کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے اور ایک زبردست انقلاب برپا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں غیر مسلموں سے ملاقات کے ذریعہ درج بالا تفصیلات وضاحت کے ساتھ بتلانی ہوں گی؛ تاکہ انہیں غور وفکر کا موقع ملے اور وہ بھی ان دسیسہ کاریوں کا جواب دینے کیلئے تیار ہوں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں سنجیدگی کے ساتھ اس طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے کہ ہمارے سرکاری دستاویزات تیار ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو اپنا نام اور والد کا نام وغیرہ سب میں یکساں ہے یا حروف کی کمی زیادتی ہے؟ یہ کام اس لیے ضروری نہیں کہ ہمیں این آر سی کا خوف ہے، یا ہم این آر سی کے نفاذ کو قبول کررہے ہیں؛ بل کہ اس لیے ضروری ہے کہ ہمیں این آر سی کا بائیکاٹ کرنا ہے اور ہمارا بائیکاٹ اسی وقت موثر ومعتبر ہوسکتا ہے جب ہمارے پاس مطلوبہ دستاویز موجود ہوں اور ہم پھر بھی بتانے سے انکار کردیں؛ لیکن ہمارے پاس سرے سے دستاویز ہی نہ ہوں تو پھر بائیکاٹ کے کیا معنیٰ۔ اس لیے خاموش انداز میں بغیر کسی شور وہنگام کے اپنے اپنے کاغذات بنانے یا ان میں یکسانیت پیدا کرنے کا کام مکمل کرلیں۔ دستاویز بنانے کے سلسلہ میں تھوڑی بہت محنت اور صبر وضبط کی ضرورت ہے ان دو باتوں کو پیش نظر رکھیں تو بہت سے غیر ضروری مصارف سے بچا جاسکتا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی برمحل ہوگا کہ این آر سی کے سلسلہ میں کس سال سے کس سال تک پیدا ہونے والوں کے لیے کیا مطلوبہ دستاویز ہوں گے؟ اس حوالے سے درج ذیل تفصیل ملاحظہ فرمائیں!

26/جنوری 1950 سے یکم جولائی 1987 کے درمیان پیدا ہونے والوں کا صرف اپنی پیدائش ثابت کردینا کافی ہے اتنے سے اس کی شہریت ثابت ہوجائے گی۔ یکم جولائی 1987 سے 3/دسمبر 2004 کے درمیان پیدا ہونے والوں کے لیے اپنی پیدائش کے ساتھ ساتھ والدین میں سے کسی ایک کی شہریت ثابت کرنا ضروری ہے۔ پھر 3/دسمبر 2004 کے بعد پیدا ہونے والوں کے لیے اپنی ولادت کے ساتھ ساتھ والد اور والدہ دونوں کا ہندوستانی ثابت کرنا ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر انہیں شہریت دی جائے گی۔

ان تمام اسباب کو اختیار کرنے کے بعد جب ہم حق تعالی سے مدد کی امید رکھیں گے اور دعائیں کرتے رہیں گے تو ان شاء اللہ ضرور مدد آئے گی اور ہم کامیاب وکامران ہوں گے۔

☆☆☆

❑ دعائیں

قنوتِ نازلہ

اور دوسری دعائیں

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

آؤ خندق کھود لیں پھر آج اپنے گرد ہم
غزوۂ احزاب شاید پھر بپا ہونے کو ہے

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم
بسم الله الرحمن الرحيم

اِذْ جَآؤُكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُونَا ہ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيْداً ھ

''جب چڑھ آئے دشمنوں کے لشکر تمہارے اوپر کی جانب سے اور تمہارے نیچے کی طرف سے، اور خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، اور کلیجے منھ کو آ گئے، اور تم لوگ اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت اہل ایمان بڑی آزمایش میں پڑ گئے اور سخت طریقے سے ہلا ڈالے گئے''۔ (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۱۰-۱۱)

اہل ایمان کے ابتلاو آزمایش کی روداد قدیم ترین زمانوں سے لوحِ ایّام پر ثبت ہے اور آج تک عنوان بدل بدل کر رقم کی جارہی ہے۔ قرآن حکیم کی مسطورہ بالا آیات میں بھی ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کو ''غزوۂ احزاب'' کہتے ہیں اور اسی کا دوسرا نام ''غزوۂ خندق'' ہے۔

یہ معرکہ آج سے ۱۴۳۵ یا ۱۴۳۶ سال پہلے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے جانے کے بعد، ہجرت کے پانچویں سال پیش آیا تھا۔ چونکہ اس موقع پر صحابۂ کرامؓ نے اپنی حفاظت کے لیے ایک خندق کھود لی تھی اس لیے اس کو غزوہ خندق کہا جاتا ہے، اور غزوۂ احزاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ بنونضیر اور بنو وائل کے یہودیوں کی اسلام دشمن سازش کے نتیجے میں، قریش اور غطفان وغیرہ کے بہت سے قبائل کے لشکروں نے متحد ہو کر مدینۂ مقدسہ پر اجتماعی یلغار کی تھی۔ حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی اور مسلمانوں کا لشکر کل تین ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا۔ اس کا تدارک کرنے کے لیے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینۂ مطہرہ کے شمال مغرب میں کم وبیش ڈھائی ہزار گز لمبی خندق کھود کر مدافعانہ جنگ کی ایک نئی حکمت عملی اختیار کی گئی تھی۔ حالت یہ تھی کہ خندق کھودنے کے دوران صحابۂ کرامؓ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شکم مبارک پر بھی پتھر بندھے ہوئے تھے۔ اور

سامنے دس ہزار فوجیوں پر مشتمل شکم سیر تازہ دم خونخوار لشکر حملہ کرنے کے لیے آمادہ تھا۔ اس وقت ظاہری حالات کے پیش نظر صحابۂ کرامؓ کی جو کیفیت تھی، سورۂ احزاب کی ان آیات میں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔

کم وبیش ایسے ہی حالات آج بھی عالمی سطح پر اور خاص طور پہ ہمارے وطن عزیز (ہندوستان) میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دم بھرنے والوں کو درپیش ہیں، بلکہ ہم تو بظاہر مدافعت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ دیدہ ودانستہ خود کو اژدھا کے منھ میں ڈھکیلنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ہم کم از کم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنی بداعمالیوں سے توبہ کر کے اپنے خالق ومالک کے سامنے ہی اپنا استغاثہ پیش کریں، اور اسی سے عاجزانہ فریاد کریں کہ اے شداد ونمرود اور فرعون کے غرور کو خاک میں ملا دینے والے اور ان کی موت کو دنیا کے لیے سامان عبرت بنانے والے، ہماری نافرمانیوں سے درگذر فرما، ہماری دادرسی کر اور ہمارے زمانے اور ہمارے سامنے کے فرعونوں کا بھی وہی انجام کر جو تو نے شداد، نمرود اور حضرت موسیٰؑ کے ہم عصر فرعون کا کیا تھا اور ہماری بھی اسی طرح مدد فرما جس طرح تو نے پیٹ پر پتھر باندھ کر جہاد کرنے والوں کی مدد فرمائی تھی۔

دعا کی اہمیت

ہمارے پاس ظاہری وسائل نہیں ہیں تو ہم یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنے اعمال کو اللہ کی مرضی کے مطابق بنائیں اور روزانہ بارگاہ الٰہی میں تضرع کے ساتھ دعائیں کریں۔ دعا کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ دعا کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل احادیث وآیات پر غور کیجیے:

اَلدُّعاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ

(دعا عبادت کا مغز ہے- ترمذی)

الدُّعَاءُ هُوَالعِبَادَة

(دعا عین عبادت ہے۔ ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

اَلَا اَدُلُّـكُـم عَـلٰى مَايُنْجِيْكُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَ يَدُرُّ اَرْزا قَكُمْ ، تَدْعُوْنَ اللّٰهَ فِىْ لَيْلِكُمْ وَ نَهارِكُمْ فَاِنَّ الدُّعَاءَ سِلاحُ الْمُؤ مِن۔

(کیا میں تمہیں وہ عمل بتاؤں جو تمہارے دشمنوں سے تمہارا بچاؤ کرے اور تمہیں بھرپور روزی دلائے، وہ یہ ہے کہ رات میں اور دن میں اپنے اللہ سے دعا کرو، کیونکہ دعا مومن کا ہتھیار یعنی اس کی خاص طاقت ہے۔ ابویعلی موصلی)

اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ

(پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ سورۃ البقرآیت۱۸۶)

اُدْعُوْنِى اَسْتَجِبْ لَكُمْ

(تم مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔ سورۃ المومن آیت۶۰)

لَا يَرُدُّالْقَدَرَ اِلَّاالدُّعاءُ

(دعا کے سوا کوئی چیز تقدیر کو نہیں بدل سکتی۔ ترمذی، مسند احمد)

مَن لَّم يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْه

(جو اللہ سے نہ مانگے اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے۔ ترمذی)

ان آیات واحادیث کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے نزدیک دعا کا کیا درجہ ہے:

۱- دعا عبادت کی اصل اور اس کی روح ہے۔
۲- دعا مؤمن کی خاص طاقت اور اس کا ہتھیار ہے۔

۳- دعا سے تقدیر بھی بدل سکتی ہے (بشرطیکہ قضائے مبرم نہ ہو)
۴- اللہ نے دعا مانگنے کا حکم دیا ہے اور اس کو قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔
۵- اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کیا کہ جو بندہ اس سے دعا نہیں مانگتا اللہ تعالی اس پر ناراض ہوتا ہے۔

قنوتِ نازلہ

قنوتِ نازلہ ایک بہت مشہور دعا ہے۔ جس کا تعلق ایک خاص واقعے سے ہے، جو اس طرح ہے کہ قبیلۂ بنو کلاب کا ایک شخص عامر بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ وہ نہ تو ایمان لایا اور نہ اس نے اسلام سے نفرت کا اظہار کیا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف یہ درخواست کی کہ اپنے آدمیوں کو ہماری بستی میں بھیج دیجیے جو وہاں جا کر دین کی دعوت دیں، مجھے امید ہے کہ وہاں کے لوگ ایمان لے آئیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی پس وپیش کے بعد ستر صحابۂ کرام کو جو سب کے سب حافظ و قاری تھے، روانہ فرمادیا۔ ان حضرات نے بئر معونہ کے مقام پر قیام کیا اور حضرت حرام بن ملحان کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دے کر عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ اس بد ذات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب مقدس کو کھول کر بھی نہیں دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو قتل کروا دیا، پھر بنو عامر کو ان صحابۂ کرام کے قتل پر اکسایا، اور ان کے انکار کے بعد اس مکار نے بنی سلیم کے تین قبیلوں رعل، ذکوان اور عصیہ کو آمادہ کیا، جنھوں نے جمع ہو کر اصحاب رسول ﷺ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور بالاخر ان ظالموں نے ان سب صحابۂ کرام کو شہید کر دیا۔ جب اس اندوہناک حادثے کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ کو اتنا شدید صدمہ اور اس قدر غم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے ایک ماہ رعل، ذکوان اور عصیہ کے لیے اپنی نمازوں میں دعائے قنوت پڑھی، جس میں ان ظالموں اور قاتلوں کے لیے لعنت اور بددعا بھی شامل تھی۔

موجودہ عالمی اور ملکی حالات کے تناظر میں تمام دنیا بالخصوص ہمارے وطن کے برادران اسلام کو یہ دعا ضرور پڑھنی چاہیے۔

قنوت نازلہ کو متعدد راویوں نے اپنی یاد داشت کے مطابق بیان کیا ہے۔ مفتی محمد شفیع مرحوم نے ۱۹۷۱ء میں اس دعا کی ایک جامع اور معتبر عبارت شائع کرائی تھی۔ ذیل میں ہم ان کی معروف کتاب ''جواہر الفقہ'' کی دوسری جلد مطبوعہ دیوبند، ۲۰۱۲ء کے ص ۴۴۵ سے دعا کا متن نقل کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی تمام مساجد کے ائمہ کرام کی خدمت میں عرض گزار ہیں کہ ہر مسجد کے امام صاحب کو یہ دعا از بر کر لینا چاہیے۔ اور قاعدے کے مطابق کم از کم ایک ماہ تک روزانہ فجر کی نماز میں ضرور پڑھنا چاہیے۔

اس دعا کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ فجر کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد اٹھتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ اور ربنا لك الحمد کہنے کے بعد کھڑے کھڑے (قومہ میں) امام صاحب اس کو ٹھہر ٹھہر کر ہر فقرے پر سانس توڑ کر پڑھیں اور تمام مقتدی دل ہی دل میں آمین کہتے رہیں پھر حسب معمول اپنی نماز مکمل کر لیں۔

(دعائے قنوت نازلہ یہ ہے)

اَللّٰھُمَّ اھْدِنَا فِیْ مَنْ ھَدَیْتَ۔ وَعَافِنَا فِیْ مَنْ عَافَیْتَ۔ وَتَوَلَّنَا فِیْ مَنْ تَوَلَّیْتَ۔ وَبَارِكْ لَنَا فِیْ مَا اَعْطَیْتَ۔ وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَیْتَ۔ فَاِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی

عَلَيْكَ۔اِنَّهٗ لَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ۔وَلَا يَذِل مَنْ وَّالَيْتَ۔تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ۔اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِلْمُومِنِين والْمُؤمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ۔وَاَصْلِحْهُمْ و اَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِهِمْ۔وَاَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ۔وَا جْعَلْ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَالْحِكْمَةَ۔وَثَبِّتْهُم عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِكَ۔ وَاَوْزِعْهُمْ اَنْ يَّشْكُرُوْانِعْمَتَكَ الَّتِی اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔وَاَنْ يُّوْفُوْا بِعَهْدِكَ اللَّذِیْ عَاهَدْتَهُمْ عَلَيْهِ۔وَانْصُرْهُمْ عَلٰى عَدُوِّكَ وَعَدُوِّهِمْ۔اِلٰهَ الْحَقِّ سُبْحَانَكَ لَا اِلٰهَ غَيْرُكَ۔اَللّٰهُمَّ انْصُرْ اَحْزَابَ الْمُسْلِمِيْنَ۔وَالْعَنِ الْكَفَرَةَ وَالْمُشْرِكِيْنَ۔اَلَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ رُسُلَكَ ۔ وَيُقَاتِلُوْنَ اَوْلِيَائَكَ۔اَللّٰهُمَّ خَالِفْ بَيْنَ كَلِمَتِهِمْ۔وَفَرِّقْ جَمْعَهُمْ۔وَشَتِّتْ شَمْلَهُمْ۔وَ زَلْزِلْ اَقْدَا مَهُمْ۔ وَاَلْقِ فِی قُلُوْ بِهِمُ الرُّعْبَ۔وَخُذْ هُمْ اَخْذَعَزِيْزِ مُّقْتَدِرٍ۔ وَاَنْزِلْ بِهِمْ بَأْسَكَ الَّذِیْ لَا تَرُدُّه عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِ مِيْن۔

(یا اللہ! راہ دکھا ہم کو ان لوگوں میں جن کو تو نے راہ دکھائی۔اور عافیت دے ہم کو ان لوگوں میں جن کو تو نے عافیت بخشی۔ اور کارسازی کر ہماری ان لوگوں میں جن کا تو کارساز ہے۔اور برکت دے ہم کو اس چیز میں جو تو نے ہم کو عطا فرمائی۔اور بچا ہم کو اس چیز کے شر سے جس کو تو نے مقدر فرمایا۔کیونکہ فیصلہ کرنے والا تو ہی ہے اور تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک تیرا دشمن عزت نہیں پا سکتا۔ اور تیرا دوست ذلیل نہیں ہو سکتا۔اے ہمارے رب تو برکت والا اور بلند و بالا ہے۔اے اللہ! مغفرت فرما مومن مردوں اور مومن عورتوں کی اور مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے گناہ معاف فرما۔اور ان کے حالات کی اصلاح فرما۔اور ان کے باہمی تعلقات کو درست فرما دے۔اور ان کے دلوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کر۔اور ان کے دلوں میں ایمان اور حکمت کو قائم فرما دے۔ اور ان کو اپنے نبیؐ کے دین پر ثابت قدم رکھ۔ اور انہیں توفیق دے کہ تیری اس نعمت کا شکر ادا کریں جو تو نے انہیں دی ہے۔اور یہ کہ وہ پورا کریں تیرا وہ عہد جو تو نے ان سے لیا ہے۔اور غلبہ عطا کر ان کو اپنے دشمن پر اور ان کے دشمن پر۔اے معبود برحق! تیری ذات پاک ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ یا اللہ! مسلمانوں کی جماعتوں کی مدد کر،اور کفار و مشرکین پر اپنی لعنت فرما۔ جو تیرے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرے دوستوں سے مقاتلہ کرتے ہیں ۔ یا اللہ ! ان میں آپس میں پھوٹ ڈال دے اور ان کی جماعت کو متفرق کر دے۔اور ان کی طاقت کو پارہ پارہ کر دے۔ اور ان کے قدم اکھاڑ دے۔ اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دے۔اور ان کو ایسے عذاب میں پکڑ لے جس میں قوت و قدرت والا پکڑا کرتا ہے۔ اور ان پر وہ

عذاب نازل فرما جس کو تو مجرم قوموں سے اٹھایا نہیں کرتا۔)

مفتی محمد شفیع مرحوم نے قنوت نازلہ کے متن سے پہلے جو نوٹ لکھا تھا ذیل میں اس کو بھی نقل کیا جارہا ہے:

''احادیث صحیحہ میں ہے کہ جب مسلمانوں کو کوئی شدید حادثہ پیش آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی حفاظت اور دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے اپنی نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھا کرتے تھے۔''درمختار''اور''نسائی'' میں ہے کہ ہر مصیبت عامہ اور دشمنوں سے خطرے اور جہاد کے موقع پر قنوت نازلہ پڑھنا اب بھی مستحب ہے۔''شرح منیہ'' میں ہے کہ قنوت نازلہ کو پڑھنا آج بھی مسنون ہے۔اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ: صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد امام بہ آواز بلند یہ دعا پڑھے، اور مقتدی (آہستہ آہستہ) آمین کہتے رہیں، اس میں نہ تکبیر کہی جائے نہ ہاتھ اٹھائے جائیں۔دعا کے بعد تکبیر کہہ کر امام اور مقتدی سب سجدے میں جائیں اور نماز پوری کرلیں''۔

کچھ اور ضروری دعائیں

قنوت نازلہ کا نماز باجماعت میں امام کی زبانی پڑھا جانا سنت ہے۔ذیل میں ہم چند دوسری مختصر مختصر دعائیں انفرادی طور پر پڑھنے کے لیے درج کررہے ہیں جن کو خاص طور پر آجکل کے تشویشناک اور پرآشوب حالات میں اللہ کی رحمت پر یقین کامل کے ساتھ ہر مسلمان کو اپنے روزانہ کے معمولات میں شامل کرلینا چاہیے۔

۱- ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ خندق کے دن ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول حالت یہ ہے کہ گھبراہٹ کے مارے ہمارے دل اچھل اچھل کر گلوں میں آرہے ہیں، کیا اس نازک وقت کے لیے کوئی خاص دعا ہے جو ہم اللہ کے حضور میں عرض کریں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں، اللہ کے حضور میں یوں عرض کرو:

اَللّٰھُمَّ اسْتُرْعَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَوْعَاتِنَا

(اے اللہ! ہماری انتہائی پردہ داری فرما اور ہماری گھبراہٹ کو بے خوفی اور اطمینان سے بدل دے)

ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ اس دعا کو پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک زبردست آندھی بھیج کر دشمنوں کے منھ پھیر دیے اور انہیں شکست سے ہم کنار کردیا۔(مسند احمد)

۲- ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی دشمن گروہ کا خطرہ ہوتا تھا تو آپؐ اللہ سے یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِ ھِمْ،وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِھِم

(اے اللہ! ہم تجھے ان دشمنوں کے مقابلے میں کرتے ہیں اور ان کی شرارتوں سے تیری پناہ مانگتے ہیں تو ان کو دفع فرما دے۔ابو داؤد، مسند احمد)

۳- عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو زبانِ مبارک پر یہ کلمات جاری ہوجاتے:

لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْم،لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْم،لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمُ۔

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بڑی عظمت والا اور حلیم ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ رب العرش العظیم ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ رب السمٰوات اور رب الارض اور رب العرش الکریم ہے۔ بخاری و مسلم)

۴- انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی، آپؐ کی دعا یہ ہوتی تھی:

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ

(اے حی و قیوم! میں بس تیری رحمت سے مدد چاہتا ہوں۔ ترمذی)

۵- سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذوالنون (یونس علیہ السلام) جب سمندر کی ایک مچھلی کے پیٹ میں پہنچ گئے تھے تو اس وقت اللہ کے حضور میں ان کی دعا اور پکار یہ تھی:

لَا اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

(یا اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو انتہائی مقدس ہے بے شک میں ہی ظالم ہوں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان بندہ کسی معاملے اور مشکل میں ان کلمات کے ذریعے دعا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرمائے گا۔ جامع ترمذی

۶- ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی بھاری مصیبت اور مشکل پیش آ جائے تو یہ کہو:

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ

(ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کار ساز ہے۔ ابن مردویہ)

صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب بت پرستوں نے آگ کے ڈھیر میں ڈالا تھا تو ان کی زبان مبارک پر یہی کلمہ تھا: **حسبنا الله و نعم الوكيل .**

۷- حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بندہ کسی سخت مشکل اور پریشانی میں مبتلا ہو اور اللہ سے اس طرح دعا کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی مشکل کو حل کر کے اس کو پریشانی سے نجات عطا فرمائے گا۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اِكْفِنِىْ كُلَّ مُهِمٍّ مِنْ حَيْثُ شِئْتَ وَمِنْ اَيْنَ شِئْتَ

(اے اللہ ساتوں آسمانوں کے اور عرش عظیم کے مالک! میری تمام مہمات و مشکلات کے حل کرنے کو تو کافی ہو جا جس طرح تو چاہے اور جہاں سے تو چاہے۔ مکارم الاخلاق خرائطی)

۸- شیخ سعید قحطانی نے مشکلات کی آسانی کے لیے اپنی کتاب ''حصن المسلم'' میں ۱۳۱ نمبر پر صحیح ابن حبان کے حوالے سے یہ دعا درج کی ہے:

اَللّٰهُمَّ لَا سَهْلَ اِلَّا مَا جَعَلْتَهٗ سَهْلًا وَاَنْتَ تَجْعَلُ الْحُزْنَ اِذَا شِئْتَ سَهْلًا

(اے اللہ، کوئی کام آسان نہیں ہے مگر جسے تو آسان کر دے، اور جب تو چاہتا ہے تو مشکل کو آسان کر دیتا ہے)

۹- قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آخری آیت میں جو دعا ہے، یہ بھی ہر مسلمان کو ازبر ہونا چاہیے اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے روزانہ پڑھتے رہنا چاہیے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْراً كَمَا حَمَلْتَهٗ

عَلَى الَّذِيْنَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ھ

(اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں ان پر گرفت نہ کر۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر)

ایک جامع دعا

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دعائیں فرمائیں جو ہمیں یاد نہیں رہیں۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول آپؐ نے بہت سی دعائیں فرمائیں ان کو ہم یاد نہیں رکھ سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمہیں ایسی دعا بتائے دیتا ہوں جس میں وہ ساری دعائیں آ جائیں، اللہ کے حضور میں یوں عرض کرو:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِمَاسَئَلَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ، صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ، وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ ما اسْتَعَاذَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ ،وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْكَ الْبَلَاغُ،وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه۔

(اے اللہ! ہم تجھ سے وہ سب مانگتے ہیں جو تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ سے مانگا، اور ہم ان سب چیزوں سے پناہ مانگتے ہیں جن سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ چاہی، بس تو ہی ہے جس سے مدد چاہی جائے، اور تیرے ہی کرم پر مقاصد اور مرادوں تک پہنچنا موقوف ہے، اور کسی مقصد کے لیے سعی وحرکت اور اس کو حاصل کرنے کے لیے قوت و طاقت بس اللہ ہی سے مل سکتی ہے۔ جامع ترمذی)

مآخذ ومراجع

۱- القرآن الکریم
۲- تفہیم القرآن ج ۱، ابوالاعلی مودودیؒ، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
۳- معارف الحدیث ج ۵، محمد منظور نعمانیؒ، لکھنؤ، ۲۰۰۱ء
۴- مفتاح کنوز السنۃ، ۱-ی فنسک رمحمد فؤاد عبدالباقی، نئی دہلی، ب ت
۵- سیرۃ النبیؐ ج ۱، شبلی نعمانیؒ، اعظم گڑھ، ۱۹۹۴ء
۶- نبی رحمتؐ، ابوالحسن علی ندویؒ، لکھنؤ، ۲۰۰۱ء
۷- اصح السیر، عبدالرؤف داناپوری، دیوبند، ب ت
۸- جواہر الفقہ ج ۲، مفتی محمد شفیع، دیوبند، ۲۰۱۲ء
۹- فقہ السنۃ، محمد عاصم الحداد، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء
۱۰- حصن المسلم، سعید بن علی القحطانی، ٹانڈا (فیض آباد) ب ت

☆☆☆

❑ اصلاحیات

مومن مَرد اور مومن عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں

مولانا ندیم احمد انصاری

چند سالوں پہلے تک مسلمان ہی نہیں، غیر مسلموں میں بھی مرد و زن کے اختلاط سے پرہیز اور پردہ کرنے کا خوب اہتمام کیا جاتا تھا اور ایسا کرنا شرافت و بزرگی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بغیر پردے کا اہتمام کیے شرم گاہ، انسانی نسب اور سماج و معاشرے کی حفاظت ممکن نہیں۔ پر افسوس! ایک گہری سازش کے تحت لوگوں کو اس سے بغاوت پر آمادہ کیا گیا اور ایسے لوگوں پر دقیانوسیت اور پرانے پن کے فقرے کسے جانے لگے، تاکہ شریروں کی راہ ہموار ہو اور اس ذہنیت کے افراد کسی قسم کی روک ٹوک نہ کرسکیں۔ جس کے لیے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جانے لگی کہ اس بابت زیادہ پس و پیش کرنا تعلیم و ترقی میں رکاوٹ ہے، جس سے آزادی ملنی چاہیے۔ ویسے یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اس طرح کی باتیں کرنے والے دوسروں کو لیکچر تو دیتے ہیں، لیکن خود اپنی بہو بیٹیوں کے معاملے میں بہت حسّاس بلکہ سخت ہوتے ہیں۔ وجہ صاف ہے کہ وہ بھی دل ہی دل میں اس کے برے نتائج کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کے کھانے اور دکھانے کے دانت جدا جدا ہیں۔

اسلام جو کہ آفاقی مذہب اور دینِ فطرت ہے، اس نے انسانی زندگی کے تمام اصولوں پر رہنمائی کی ہے اور جو معاملہ جتنا نازک تھا اسے بیان کرنے میں اسی قدر شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز جیسی مہتم بالشان عبادت کا بیان تو اجمال کے ساتھ، لیکن نکاح، طلاق، وراثت اور نگاہ و شرم گاہ کی حفاظت جیسے امور کا بیان خاصی تفصیل سے کیا گیا ہے، کیوں کہ یہ وہ مسائل ہیں جن میں صحیح رہنمائی نہ ہونے کے سبب فساد کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ مضمونِ ہٰذا میں اسی سلسلے کی چند آیات پیش کرنا مقصود ہے۔

اجنبی نوجوان لڑکے لڑکیاں بہت سی ایسی نامناسب حرکتیں کرتے نظر آتے ہیں جو عقل و شرع کے لحاظ سے مذموم و ممنوع ہیں۔ واضح رہے کہ جنسی تقاضوں کے فطری ہونے کے سبب ربِ کائنات نے اس کا پورا پورا لحاظ رکھا اور ارشاد فرمایا ہے: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ، اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ - تم میں سے جن (مَردوں یا عورتوں) کا اس وقت نکاح نہ ہو، ان کا بھی نکاح کراؤ، اور تمھارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو نکاح کے قابل ہوں، ان کا بھی۔ اگر وہ تنگ دست ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انھیں بے نیاز کردے گا، اور اللہ بہت وسعت والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔ (النور) لیکن ساتھ ہی زنا جیسی انسانیت

سوزحرکت سے باز رکھنے کے لیے یہ پابندی بھی عائد کر دی :وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَاوَمَا بَطَنَ۔ اور بےحیائی کے کاموں کے پاس بھی نہ پھٹکو!(الانعام) نیز ارشاد فرمایا:وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً، وَسَآءَ سَبِيْلًا۔ اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، وہ یقینی طور پر بڑی بے حیائی اور بےراہ روی ہے۔(الاسراء)

زنا کی قباحت میں سلف سے خلف تک عقلا کو اتفاق ہے، اس میں یہ چند قباحتیں ہیں: (۱) انساب کا خلط ملط ہونا، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس کا بیٹا ہے؟ پھر باہمی حصے، ترکے میں خرابی آتی ہے (۲) عورت کو شرعی یا عرفی طور پر اگر ایک شخص خاص سے تعلق نہ ہو جس کو نکاح کہتے ہیں، تو اس کے پاس آنے والوں میں باہمی قتال وجدال کی نوبت آئے گی، جیسا کہ مشاہدے میں آتا ہے اور یہ بات تخریبِ عالم کا باعث ہے (۳) عورت سے مقصود صرف شہوت رانی ہی نہیں بلکہ باہم مل کر خانہ داری کے امور میں ایک دوسرے کا معین ہونا' مرد کما کر لائے ' عورت دردمندی اور کفایت کے ساتھ اس کو گھر میں اٹھائے، دونوں مل کر بچوں کی تعلیم وتربیت میں کوشش کریں اور نیز بیماری اور پیری میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیں، ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ کمال درجے کی درمندی ہو، اور یہ بات جب تک ممکن نہیں کہ عورت کی نظر ایک ہی شخص پر رہے اوروں سے علاقہ نہ رکھے، اور یہ بغیر اس کے کہ زنا کو حرام کیا جائے، ممکن نہیں (۴) اگر زنا کا دروازہ کھل جائے تو انسان اور بہائم میں کیا فرق رہے، جس عورت کو چاہے رکھے اور نیز باہم الفت ومحبت کبھی پیدا نہ ہو۔ ان سب باتوں کے لحاظ سے شرع نے زنا کو حرام کیا اور یہاں تک تاکید کے لفظ استعمال کیے کہ اس کے پاس جانے کی بھی ممانعت کر دی یعنی اس کے اسباب سے بھی روک دیا۔ زنا کے بہت سے اسباب ہیں؛ نامحرم عورتوں سے تخلیہ کرنا، ان سے ہنسی مذاق کرنا' ان سے رسمِ ملاقات بڑھانا، لگاوٹ کی باتیں کرنا، فحش تصاویر دیکھنا، فساق کے عشق آمیز افسانے سننا، اس قسم کی نظم ونثر کا عادی ہونا' تھیٹروں اور ناجائز مجامع میں جانا ' راگ و باجے سننا ' ناچ دیکھنا دکھانا وغیرہ۔(تفسیرِ حقانی) اس آیت کے تحت اس طرح کے تمام امور ناجائز وحرام ٹھہرے۔ گویا اس جامع اندازِ تکلم میں صرف زنا سے نہیں بلکہ ہر اس کام سے بھی روک دیا گیا، جو زنا کے قریب لے جانے والا ہو۔

ظاہر ہے کہ زنا ایسا عمل نہیں کہ بغیر نظریں ملائے اور تعلق بنائے انجام پا جائے، اور اس کے کچھ چور دروازے ہیں، جنھیں بند کیے بغیر اس گناہ سے بچنا مشکل ہے، اس لیے اپنی شانِ رحمت سے باری تعالیٰ نے خود ہی ان کی بھی نشان دہی فرما دی اور نہایت اہتمام کے ساتھ مَردوعورتوں کو مستقلاً حکم دیا: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ، ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ، اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۔ مومن مَردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہی ان کے لیے پاکیزہ ترین طریقہ ہے۔ وہ جو کاروائیاں کرتے ہیں، اللہ ان سب سے پوری طرح باخبر ہے۔(النور) اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ، وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْاٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوَاتِهِنَّ اَوْنِسَآئِهِنَّ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِالتَّابِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ، وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ، وَتُوْبُوْٓا

اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّہَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی سجاوٹ کو کسی پر ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو خود ہی ظاہر ہو جائے، اور اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے گریبانوں پر ڈال لیا کریں، اور اپنی سجاوٹ اور کسی پر ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپ، یا اپنے شوہروں کے باپ کے، یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے، یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے، یا اپنی عورتوں کے، یا ان کے جو اپنے ہاتھوں کی ملکیت میں ہیں، یا ان خدمت گزاروں کے جن کے دل میں کوئی (جنسی) تقاضا نہیں ہوتا، یا ان بچوں کے جو ابھی عورتوں کے چھپے ہوئے حصوں سے آشنا نہیں ہوئے، اور مسلمان عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ ماریں کہ انھوں نے جو زینت چھپا رکھی ہے وہ معلوم ہو جائے، اور اے مومنو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو، تاکہ تمھیں فلاح نصیب ہو۔ (النور)

سجاوٹ سے مراد جسم کے وہ حصے ہیں جن پر زیور پہنا جاتا ہے، یا خوشنما کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس آیتِ کریمہ نے عورتوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ غیر محرم مَردوں کے سامنے اپنا پورا جسم کسی ایسی چادر یا برقع سے چھپائیں جو ان کے سجاوٹ کے مقامات کو چھپالے، البتہ ان مقامات میں سے کوئی حصہ کام کاج کے دوران بے اختیار کھل جائے، یا کسی ضرورت کی وجہ سے کھولنا پڑے، تو اسے یہ کہہ کر مستثنیٰ کر دیا گیا ہے کہ سوائے اس کے، جو خود ہی ظاہر ہو جائے ۔۔۔ یہاں سے ان افراد کی فہرست دی جا رہی ہے جن سے عورتوں کو پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اپنی عورتوں سے مراد مسلمان عورتیں ہیں، لہٰذا غیر مسلم عورتوں سے بھی پردہ ضروری ہے، لیکن چوں کہ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ غیر مسلم عورتیں ازواجِ مطہرات کے پاس جایا کرتی تھیں، اس لیے امام رازیؒ اور علامہ آلوسیؒ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اپنی عورتوں سے مراد اپنے میل جول کی عورتیں ہیں، تو چاہے مسلمان ہوں یا کافر، ان سے پردہ واجب نہیں ہے۔ (دیکھیے توضیح القرآن)

نیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے محض احکام ہی نازل نہیں کیے بلکہ ان احکامات کی پاسداری کرنے والوں کو یہ مژدہ بھی سنایا: اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ، اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا۔ بے شک فرماں بردار مرد ہوں یا فرماں بردار عورتیں، مومن مرد ہوں یا مومن عورتیں، عبادت گزار مرد ہوں یا عبادت گزار عورتیں، سچے مرد ہوں یا سچی عورتیں، صابر مرد ہوں یا صابر عورتیں، دل سے جھکنے والے مرد ہوں یا دل سے جھکنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد ہوں یا صدقہ کرنے والی عورتیں، روزے دار مرد ہوں یا روزے دار عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد ہوں یا حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد ہوں یا ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور شان دار اجر تیار کر رکھا ہے۔ (الاحزاب)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمجھ اور اپنی نگاہ اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین

☆☆☆

□تاریخ کے جھروکوں سے

قسط-۷

''ہندوستان کے عہد ماضی میں

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری-جلدسوم'' ایک مطالعہ

(مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

مصنف نے یہاں پھر یہ ذکر کیا ہے کہ مندر توڑے گئے، مگر جو بھی توڑے گئے ان کے کچھ اسباب تھے، وہ اسباب اُس دور کے مورخین اور موجودہ عہد کے مورخین نے بیان کیے ہیں، ان کو دوہرانے کی ضرورت نہیں، یہاں انھوں نے پھر سے مسلم ریاست میں دیگر قوموں کے رہنے سے متعلق اسلام کی تعلیم کا تذکرہ کیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ اگر مسلم ریاست میں غیر مسلم وفاداری کے ساتھ رہیں اور طالب امن وامان ہوں تو ان کی جان ان کے مال حتی کہ ان کے عبادت خانے سب کو امان دی جائے گی اور ان کی حفاظت کی جائے گی، وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ ''اسلام کی ان تعلیمات کی خلاف ورزی ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے اگر کبھی کبھار کی تو قابل ملامت ہیں'' لیکن مصنف کے مطابق ان کا رشتہ اسلام سے جوڑنا سراسر ظلم و زیادتی ہے، انھوں نے لکھا ہے:

''ہندوستان میں ہندوؤں نے جتنی مسجدیں شہید کیں، ان کی تفصیل لکھی جائے تو یہ منافرت اور بڑھے گی، ایسی مثالیں بھی ہیں کہ مغلوں کے عروج کے زمانہ میں ہندوؤں نے مسجدوں کو توڑ کر ان کا اپنا گھر بنالیا تھا، اس کی تفصیل عبدالحمید لاہوری کی تاریخ بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۵۷ میں ملے گی، علی عادل شاہ نے ۹۷۶ھ میں بیجانگر کے راجہ رام کو نظام شاہ بحری کے مقابلہ میں اپنی مدد کو بلایا تو رام راج نے علی عادل شاہ کے قلمرو میں تمام مسجدیں جلادیں''۔(ص ۱۶۹)

انہوں نے لکھا ہے کہ خود مغلوں کے سکھوں کے عہد عروج میں بھی کثرت سے مسجدیں توڑی گئیں، ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد ہندوستان میں مسجدوں کو جس طرح برباد کیا گیا اس کی تاریخ بڑی شرمناک ہے، مصنف نے یہاں مسجدوں کی مسماری کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد کی India Divided کی تعریف کی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب تلخی کو دور کرنے اور رواداری وفراخدلی کو فروغ دینے کے لئے لکھی گئی، اس کتاب کے حوالے سے انھوں نے مسلم حکمرانوں کی مذہبی، اور سیاسی اور علمی رواداری پر اس کے تبصرے نقل کیے ہیں، ہم یہاں ان تبصروں کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نذر قارئین کرتے ہیں:

''عملی طور پر ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ مسلمان بادشاہوں نے مندروں اور مٹھوں کے لیے جائدادیں وقف کیں اور عبادت گذار اور صاحب علم

وکمال پنڈتوں کو جاگیریں دیں، یہ تو بہت کچھ دکھایا جا چکا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے کتنے مندروں اور عبادت گاہوں کو مسمار کیا لیکن اگر کوئی محقق ان کثیر التعداد اوقاف اور جاگیروں کی فہرست تیار کردے جو مسلمان حکمرانوں کی طرف سے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو دی گئی ہیں، تو یہ بڑا مفید کام ہوگا، جنوبی ہند کی تاریخ کے طلبہ کو ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ عادل شاہی اور قطب شاہی اور آصف شاہی بادشاہوں نے برہمنوں کے لیے بہت سی جاگیریں وقف کیں ، بودھ گیا کے مہنت کی زمینداری کی سالانہ آمدنی لاکھوں روپئے ہے ، یہ زمینداری دہلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ کا عطیہ ہے، جسے اس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے مہنت لال گیر کو مستی پورتاراڈیہہ کا پورا علاقہ عطا کیا تھا، مہاراجہ دربھنگہ کا علاقہ ہندوستان کی سب سے بڑی زمینداری ہے جو اکبر نے موجودہ مہاراجہ دربھنگہ کے مورث اعلیٰ کو دی تھی جو زہد وفضل میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، شیر شاہ نے ہندو رعایا کی تعلیم کے لیے جاگیریں وقف کیں ، ان جاگیروں کا انتظام خود ہندو ہی آزادانہ طریقہ پر کرتے تھے، کشمیر کا حکمراں سلطان زین العابدین امرناتھ اور شاردا دیوی کے مندروں میں گیا تو وہاں کے زائرین کے آرام و آسائش کے لیے مکانات تعمیر کرائے، ۱۷۸۰ء میں ہردوار نجیب آباد کے پٹھانوں کے زیر نگیں تھا، نجیب آباد کے نواب نے ہردوار کے جاتریوں کے لیے بڑے بڑے مکانات تعمیر کرائے جو آج تک موجود اور ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں''۔(ص۱۷۳)

آگے مصنف نے اورنگ زیب کے ذریعہ مندروں مٹھوں اور گردواروں کو دی جانے والی جاگیروں اور اوقاف کے متعدد واقعات بیان کیے ہیں، ان واقعات کو انھوں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دیگر مورخین کے حوالے سے قلمبند کیا ہے، ان صفحات کو پڑھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اپنی تمام رعایا کے مذہبی جذبات کا بھرپور احترام کرتا تھا اوران کے سلسلہ میں پوری احتیاط سے کام لیتا تھا۔

مصنف نے ایک عنوان <u>ہندو پجاریوں کو جاگیریں</u> قائم کیا ہے، اس میں انھوں نے جنن چندر کے حوالے سے گفتگو کی ہے انھوں نے اس باب میں ۱۳؍فرامین نقل کیے ہیں جنھیں پڑھ کر اورنگ زیب پر تنگ نظری کا الزام لگانے والے کو واقعی اپنی رائے پر نظر ثانی کر لینا چاہیے، کیوں کہ ان سب سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہی کہ اورنگ زیب نے مندروں کو جاگیریں دیں، پجاریوں کو جاگیریں دیں، وظیفے جاری کیے، جن کو جو کچھ ملتا تھا وہ باقی رکھا، <u>عالمگیر کے عہد میں ہندوؤں کو پوجا کی آزادی</u> تھی، اس پر اس کے معاصر مورخین کی شہادتیں بھی موجود ہیں اور اس دور کے مورخین نے بھی اس کے ثبوت فراہم کیے ہیں، مصنف نے اس عنوان کے تحت اس کے بعض ایسے فرامین کا ذکر کیا ہے جس سے وضاحت ہوتی ہے کہ ہر ایک کو اپنے مذہب پر عمل کی مکمل آزادی تھی، انھوں نے بعض جینی شعراء کا اورنگ زیب کی مدح میں کہا گیا کلام نقل کر کے یہ سوال قائم کیا ہے کہ اگر اورنگ زیب اتنی ڈراونی شخصیت کا مالک ہوتا اور ظالم ہوتا، دوسروں کو ان کے مذہب کے مطابق پوجا پاٹ سے روکتا تو یہ جینی اس حد تک اس کی تعریف کیسے کرتے ،انھوں نے جنن چندر کے حوالے سے لکھا ہے:

''ایک اور مضمون میں جنن چندر لکھتے ہیں کہ یہ افسوسناک بات ہے کہ متعصب مؤرخوں نے اورنگ زیب کو ہندوؤں کا دشمن ظاہر کرنے میں

کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے اور اگر ان کی مرضی کے خلاف کوئی شہادت مل جاتی ہے تو وہ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں، ایسی شہادتوں میں سے ایک شہادت برنیز کے سفرنامہ میں بھی ملتی ہے، جس میں عالمگیر کے محل کے نیچے سورج گرہن کے موقع پر ہندوؤں کے اشنان کی پوری تفصیل ملتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ: ''میں نے دریا کے دونوں کناروں پر بت پرستوں کو تقریباً ایک لیک یعنی تین میل تک دیکھا اور مغل اعظم ایک مسلمان ہے لیکن اس نے اس قسم کی قدیم توہم پرستی کی اجازت دے رکھی ہے''۔(ص۱۹۳)

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے معاصر جینی لٹریچر کی روشنی میں عالمگیر کی رواداری کی دلیلیں فراہم کی ہیں، یہاں بھی وہ لکھتے ہیں کہ جنن چندر نے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''ہندوؤں کے خیال میں اورنگ زیب ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ بدنام حکمراں گزرا ہے اور اس پر برابر یقین کیا گیا ہے کہ وہ ہندوؤں کا دشمن تھا اور اس سے جو کچھ بن پڑا ہندو مذہب اور اس کے پیروؤں کے خلاف برائی کرتا رہا، جو مؤرخین اس قسم کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں وہ ایسی شہادتیں پیش کرتے وقت ان کا صحیح تجزیہ نہیں کرتے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کی نظر ایسے ماخذوں پر نہیں ہے جو اورنگ زیب پر ایک حکمراں اور اسلام کے ایک پرہیز گار، پیرو کی حیثیت سے صحیح روشنی ڈالتے ہوں، مجھ کو حال ہی میں جینی ماخذوں میں کچھ ایسی شہادتیں ملی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اسلام کی طرح دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں کا پورا احترام کرتا تھا''۔(ص۱۹۷)

اس عنوان کے تحت کچھ مثالیں پیش کرنے کے بعد غیر مسلموں کے ساتھ اورنگ زیب کا رویہ عنوان قائم کر کے مصنف نے اس کے بعض فرامین کو نقل کیا ہے اور پھر ایک برہمن کے ساتھ اس کے فیاضانہ سلوک پر روشنی ڈالی ہے، اس کے بعد ایک عنوان اورنگ زیب اور مذہبی پیشوا قائم کیا ہے، اس میں شاہ محمد بدخشانی، سرمد اور بعض دیگر کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، یہاں مصنف نے صاف لکھا ہے کہ سرمد جس وحدۃ الوجود کے قائل تھے اس کو قطعی قبول نہیں کیا جا سکتا، مصنف اس ضمن میں دوٹوک تبصرہ کرتے ہیں:

''سرمد کی شہادت کا تعلق اورنگ زیب کے مذہبی تعصب کے بجائے اسلام کے علماء کا مذہبی مسئلہ ہے جس میں جدوناتھ سرکار کی مؤرخانہ مداخلت بالکل بیجا ہے''۔(ص۲۰۱۔۲۰۲)

اس کے بعد اورنگ زیب اور سکھ کے عنوان سے اورنگ زیب کے ذریعہ سکھوں کی سرکوبی پر روشنی ڈالی ہے، یہاں مصنف نے دو اہم نکتے بیان کیے ہیں، ایک تو یہ کہ جدوناتھ سرکار کو راجپوت اور مرہٹہ سے جتنی ہمدردی ہے سکھوں سے اتنی ہمدردی ان کی تحریروں سے ظاہر نہیں ہوتی، انھوں نے اس باب میں ان ہی کی تحریروں کے حوالے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''جدوناتھ سرکار کے ان تمام اقتباسات سے ظاہر ہے کہ اورنگ زیب نے سکھوں کے خلاف مذہبی ایذا رسانی کی کوئی مہم نہیں چلائی تھی، بلکہ ان کی سرکوبی سیاسی اور فوجی سطح پر کی''۔(ص۲۰۵)

آگے کے مباحث بیجاپور اور گولکنڈہ پر لشکر کشی کے اسباب سے بحث کی گئی ہے، مصنف نے لکھا ہے کہ اگر

چہ جدو ناتھ سرکار نے ہسٹری آف اورنگ زیب کی ج ۳ کے چوتیسویں باب میں اسلام کے خلاف خوب زہر افشانی اور ہرزہ سرائی کی ہے لیکن جب بیجا پور اور گولکنڈہ پر اورنگ زیب کی لشکر کشی پر بحث کی ہے تو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ اورنگ زیب کا مذہبی جنون حد سے بڑھا ہوا تھا اس لیے وہ ان شیعہ ریاستوں کو ختم کر دینا چاہتا تھا، مصنف نے یہاں اول تو یہ تبصرہ کیا ہے کہ اورنگ زیب پر شیعہ دشمنی کا الزام لگانا اس کی گھریلو اور خاندانی زندگی سے ناواقفیت کی دلیل ہے، دوسرے انھوں نے جدو ناتھ سرکار کی ہی تحریروں اور اقتباسات سے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر یہ ریاستیں مرہٹوں کا ساتھ نہ دیتیں تو اورنگ زیب ان کو نہ ختم کرتا، جدو ناتھ کے جو اقتباسات مصنف مرحوم نے نقل کیے ہیں ان سے خوب واضح ہوتا ہے کہ یہ محض سیاسی جنگ تھی، ان میں کہیں شیعہ سنی رنگ نہ تھا، مگر باوجود اپنی اسلام دشمنی کے جدو ناتھ نے ان جنگوں کو شیعوں کے خلاف مہم قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی اسلام دشمنی کی ایک دانشمندانہ کوشش ہے۔

اس کے بعد مصنف نے **اورنگ زیب کے عہد کی علمی رواداری** پر اختصار و جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، مصنف نے لکھا ہے کہ عالمگیر سے منسوب بعض دو ہے بھی مشہور ہیں، انھوں نے ہندی سے اس کی دلچسپی کے بعض دیگر دلائل بھی ذکر کیے ہیں، یہاں مصنف نے اس عہد میں مختلف علوم وفنون میں مدون کی گئی کتب کا ذکر کیا ہے، مختلف علوم وفنون کے مصنفین پر ادبار عالمگیری کی سرپرستی کا تذکرہ کیا ہے، اس کے بعد **اورنگ زیب کی حکومت کے استحکام کے اعتراف** پر گفتگو کی ہے، ابتدا میں یہ شکوہ کیا ہے کہ عام طور پر ہندو مورخین اورنگ زیب کا اچھا تذکرہ نہیں کرتے مگر پھر بھی ان کے یہاں اعترافات ملتے ہیں، مصنف نے اس عنوان کے ذیل میں پروفیسر شری رام شرما کے ایک مضمون کی تلخیص پیش کی ہے، جس کو پڑھ کر یہ اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ اس کی حکومت مستحکم تھی، اس نے متحدہ ہندوستان کو وجود بخشا تھا، ملکی انتظام کو منظّم و مرتب کرنے میں اس کا کردار نمایاں تھا۔

مصنف نے اس کے بعد ایک اہم عنوان قائم کیا ہے۔ **اورنگ زیب کے بعد کے مغل فرمانروا** یہ عنوان کیوں قائم کیا اور اس کے تحت انھوں نے کیا لکھا اور کیوں لکھا ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کر لیجئے اگر چہ اس کی تفصیلات پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں، انھوں نے واضح کیا ہے کہ اورنگ زیب کو ظالم اور غیر روادار ثابت کرنے کے لئے بعد کے لوگوں کی رواداری کا بھی انکار کیا گیا اور بسا اوقات ٹھیکرا اورنگ زیب کے سر پر ہی پھوڑا گیا، وہ لکھتے ہیں:

''جدو ناتھ سرکار نے اپنی کتاب ''ہسٹری آف اورنگ زیب'' میں یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ راجپوتوں نے اورنگ زیب سے تصادم اپنی حب الوطنی کی خاطر کیا اور مرہٹے اس سے ہندوستانی نیشنلزم میں سرشار ہوکر، اب دیکھنا یہ ہے کہ حب الوطنی اور نیشنلزم کے علمبرداروں کا یہ رویہ نالائق اور کمزور جانشینوں کے ساتھ کیا رہا، اب تک ہم جدو ناتھ سرکار کی تحریروں ہی کا سہارا لے رہے ہیں، آئندہ صفحات میں بھی ان ہی کا سہارا لیں گے، ہسٹری آف اورنگ زیب لکھنے کے بعد انہوں نے پہلے تو ولیم ارون کی لیٹر مغلز کی دو جلدیں اڈٹ کر کے شائع کیں، پھر فال آف دی مغل امپائر کے عنوان سے چار جلدیں لکھیں، ان ہی کتابوں کے حوالے برابر آئیں گے تا کہ اندازہ ہو کہ جدو ناتھ سرکار کی تاریخ نویسی کس

انداز کی تھی ، پہلے وہ کیا کہتے ہیں اور بعد میں کیا کہہ جاتے ہیں ، یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ سے جو ذہن بنایا، اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ انہوں نے جو لکھ دیا ہے اسی کو پڑھ کر اندازہ ہوجاتا ہے کہ نہ صرف اورنگ زیب غیر روادار تھا بلکہ دوسرے مغل شہنشاہوں میں بھی مذہبی رواداری نہ تھی، آئندہ کی تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ راجپوت اورنگ زیب کے جانشینوں سے اورنگ زیب کی پالیسی کی وجہ سے بدظن تھے یا ان کے وفادار بنے رہے''۔(ص۲۳۴۔۲۳۵)

اس باب میں انھوں نے بہادر شاہ اول، جہاندار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ آگرہ، اودھ اور مالوہ کے ہندو صوبہ دار اور مغل تخت وتاج کے لیے راجپوت راجاؤں کی وفاداری سے متعلق گفتگو کی ہے۔

آگے مصنف نے مغلوں کے عہد میں راجپوتوں کا عروج سر جدوناتھ سرکار کی نگاہ میں عنوان قائم کیا ہے، اور پھر ان کی تحریروں کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور اپنی حیرت اور حد سے زیادہ تعجب کا اظہار کیا ہے کہ آخر ایک مورخ کے یہاں اس قدر تضاد بیانی کسی طرح ممکن ہے، ایک طرف وہ راجپوتوں کی لڑائیوں کو جذبہ حب الوطنی میں سرشاری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور انھیں ہندو کیریکٹر کا بہترین نمائندہ قرر دیتے ہیں دوسری طرف وہ راجپوتوں کے باہمی نفاق، ان کی عیاشی، بدکرداری، بزدلی و پست ہمتی کے الزامات بھی ان پر عائد کرتے ہیں، مصنف نے ان کا ایک تبصرہ نقل کیا ہے:

''ایک راجپوت زمین کی خاطر ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کر لیتا، باپ بیٹے کو مار ڈالتا، بیٹا باپ کو قتل کر دیتا، شریف ترین خاندان کی عورتیں اپنے بہت ہی قابل اعتماد رشتہ داروں کو زہر دے دیتیں، راجہ اپنے وفادار وزیروں کی جان لے لیتے، رام دیوتا کی اعلی ترین نسل سے پیدا ہونے والے راجپوت بھی ایک بیرونی ڈاکو کی مدد حاصل کر کے اپنے خانگی جھگڑوں کا فیصلہ کراتے''۔(۲۶۹۔۲۷۰)

پھر مصنف نے یہ بھرپور تبصرہ کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''اگر راجپوتوں کا یہی کیریکٹر تھا کہ خود غرض اور مفاد پرست تھے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے یہاں ملک اور وطن کی محبت نہ تھی، صرف اپنے مقاصد ذاتی کو سامنے رکھتے، پھر جدوناتھ سرکار کا یہ لکھنا کہاں تک صحیح ہے کہ راجپوت اورنگ زیب سے حب الوطنی کے جذبے میں لڑتے رہے، جس کو وہ بار بار دہراتے ہیں، اور جب راجپوتوں کا یہ وطیرہ تھا کہ باپ بیٹے پر، بیٹا باپ پر، بیوی شوہر پر، شوہر بیوی پر، راجہ وزیر پر اور وزیر راجہ پر اعتماد نہ کرتا، تو مغل بادشاہوں میں کوئی بھی خواہ اورنگ زیب ہی کیوں نہ ہو، ان پر اعتماد نہ کرتا، تو وہ مورد الزام قرار نہیں دیے جا سکتے، اور جب جدوناتھ سرکار کو راجپوتوں کے ایسے کیرکٹر کا احساس ہوا تو مغلوں کو ان کے اس کیرکٹر کا اندازہ ضرور رہا ہوگا، لیکن مغلوں کی یہ رواداری اور فراخ دلی کا بڑا ثبوت ہے کہ راجپوتوں کے ان عیوب کو سمجھتے ہوئے، ان کو اپنے دربار اور میدان جنگ میں اپنا معتمد بنائے رکھا اور ان کی سپہ گری کا جوہر ابھار کر تاریخ میں ان کو قابل فخر مقام عطا کیا، مغلوں کے زوال اور خاتمہ کے بعد ان کی ساری سپہ گری اور پامردی ختم ہوگئی، برطانوی حکومت میں ان کو وہ

مقام حاصل نہیں ہوا جو ان کو مغلوں کے دربار میں تھا''۔(۲۷۰)

اس کے بعد صاحب تصنیف نے راجپوتوں پر مغل فرمانرواوں کے اعتماد کی کچھ تفصیلات لکھی ہیں، پھر مغلوں کے زوال اور راجپوتوں کے خاتمہ پر روشنی ڈالی ہے، پھر آخری مغل فرنرواؤں کے عہد کی علمی رواداری کا جامع تذکرہ کیا ہے۔

آخر میں مصنف نے منصف مزاج اور تاریخی امانتداری کا احساس رکھنے والے ہندو مؤرخین کے مغلوں کی حکومت پر تبصرے نقل کیے ہیں جن سے مغلوں کی سیاسی، سماجی اور سب سے بڑھ کر مذہبی رواداری کی منصفانہ تاریخ سامنے آتی ہے، جن مورخین کے انھوں نے تبصرے نقل کیے ہیں، ان میں پروفیسر شری رام شرما، پروفیسر رام پرشاد کھوسلا، ڈاکٹر پی سرن، بی این پانڈے، شری این سی سکسینہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

شری رام شرما کے تبصرے کا ایک اقتباس دیکھیے:

''اسی طرح ہندوؤں کے قوانین کی کتابیں بھی مرتب ہوئیں، کاملاکر، راگھونندن، مترمصرا نرسنگھ اور دوسرے اہل قلم نے ہندوؤں کے قوانین کو ترتیب دینے میں قابل قدر محنت کی ہے، انہوں نے قدیم قوانین کو نہ صرف مدون کیا بلکہ متنازع فیہ اور پیچیدہ مسائل کو واضح کر کے نئے قوانین بھی بنائے، ان کی تدوین میں مغل بادشاہوں نے کسی قسم کی مداخلت نہ کی اور نہ ہندوؤں کی پنچایت کی کارروائیوں میں انہوں نے کبھی اپنی شہنشاہیت اور استبداد کا مظاہرہ کیا''۔(ص۲۸۵)

پروفیسر رام پرشاد کھوسلا کے تبصرے میں مصنف نے جو عناوین قائم کیے ہیں ان پر ایک نظر ڈالیے اور پھر موقع ملے تو اصل کتاب ضرور پڑھیے: ''فیض رساں بادشاہت، قیام امن، کاشتکاروں کی محافظت، فنون کی ترقی، علوم کی سرپرستی، عدل گستری، مذہبی رواداری، رعایا نوازی۔

ڈاکٹر پی سرن نے مغلوں کے نظام عدل پر بہت گفتگو کی ہے اور اس کی عمدہ ترین مثالیں پیش کی ہیں، انھوں نے اس دور کے عدالتی نظام اور قانونی کارروائی کے نظام پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور اس کو بہت سراہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مغل بادشاہ منصفانہ فیصلے کرنے میں بہت سخت تھے، اگر مجرم کوئی بڑا عہدے دار یا بادشاہ کا رشتہ دار بھی ہوتا تو بھی اس کو سخت سے سخت سزا دینے میں تأمل نہ کیا جاتا تھا اور غلط قسم کے وقار اور رعب کو انصاف میں حائل ہونے نہیں دیا جاتا اور ہر حالت میں حکومت کی نیک نامی کا لحاظ رکھا جاتا تھا، مغل حکمراں عوام کا اعتماد حاصل کر کے اپنا وقار قائم کرنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے، وہ بے جا رعب بٹھانے کے قائل نہ تھے، ان کو جب کبھی کسی حاکم کے ظلم اور غیر منصفانہ رویہ کی خبر ملتی تو اس کو سخت سزا دینے میں مطلق تأمل نہ کرتے، تمام مغلیہ سلاطین کا یہی طریقہ رہا''۔(ص۲۹۹)

بعد ازاں مصنف نے ۲۹/ جولائی ۱۹۷۷ء کو پارلیمنٹ میں کی گئی پروفیسر بی این پانڈے کی تقریر کے کچھ حصے نقل کیے ہیں، پانڈے صاحب کی یہ طویل تقریر اس تناظر میں ہوئی تھی کہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کا نصاب کیا ہو جس سے ثقافتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو سکے، مصنف نے یہاں ان کی تقریر کے ان حصوں کو نقل کیا ہے جس میں انھوں نے یورپی مصنفوں کی کتابوں کے برے

اثرات اور بدترین نتائج اور دلوں کو توڑنے اور ہم آہنگی و رواداری کو ختم کرنے نیز نفرت و عداوت کو جنم دینے کے اثرات پر اظہار خیال کیا ہے، **ہنری ایسٹ کی شرانگیزی** اور **برطانوی حکومت کے شرانگیز دستاویزات** پر گفتگو کی ہے، **ٹیپو سلطان کے ذریعہ مندروں کی سرپرستی**، **مندروں کے لیے اورنگ زیب کے فرامین** کو مسلم حکمرانوں کی رواداری کے ثبوت میں پیش کیا ہے، **وشوناتھ مندر** کے انہدام کے اسباب کی وضاحت کی ہے **گولکنڈہ کی مسجد** کو تباہ کرنے کا تذکرہ کیا ہے، **شیواجی کی حکومت میں مسلمان افسروں** کا ذکر کیا ہے، پھر مصنف نے شری این سی سکسینہ کی روداد کا خلاصہ نقل کیا ہے، جس میں سکسینہ صاحب نے وضاحت کی ہے ہندی کی نصابی کتابوں میں سیکولرزم کی خلاف ورزی کی گئی ہے، واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے اور بعض شخصیات کی بری تصویر بنا کر پیش کی گئی ہے، ایک نصابی کتاب کے اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں زیادہ تر اس پر زور دیا گیا ہے کہ رانا پرتاپ اور شیواجی نے اپنی مادر وطن کی آزادی کے لیے مغلوں کے خلاف کیسی جدوجہد کی، سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں مغلوں کی حکومت غیر ملکی تھی، یہ یقین دلایا جائے تو اگر موجودہ ہندوستان کے مسلمان یہ تصور کریں کہ وہ ایک غیر ملکی حکومت میں رہ رہے ہیں اس لیے کہ یہاں کا وزیر اعظم اور راشٹر پتی دونوں ہندو ہیں تو کیا ان کا یہ سمجھنا صحیح ہوگا، شیواجی ایک قومی ہیرو کیسے ہوسکتا ہے، جب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ ایک فرقہ پرست مرہٹہ تھا، اپنے مذہب میں بہت کٹر تھا، تاریخ لکھنے والے اور ہماری حکومت کے ذمہ دار لوگ اس کا جواب دیں''۔(۳۲۰)

حقیقت یہ ہے کہ یہ اور ان جیسے مورخین کی دیانتدارانہ تاریخی تحقیقات کو اگر عام کیا جائے تو فرقہ پرستی کے جن کو لگام لگائی جاسکتی ہے، عدم رواداری کا بھوت اتارا جا سکتا ہے، نفرت و شرانگیزی کی آگ دبائی جا سکتی ہے، مذہبی رواداری، برداشت اور باہمی تعاون کو فروغ دیا جا سکتا ہے، ضرورت ہے کہ جن واقعات اور شخصیات کو موضوع بنا کر نفرت و شرانگیزی کو فروغ دیا جاتا ہے ان کے متعلق خود منصب مزاج ہندو مورخین کی تاریخی شہادتوں کو عام کیا جائے، ہم تو اسی پر ماتم کرتے ہیں کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کی یہ بیش قیمت کتاب آج تک ہندوستان کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہوکر عام نہ ہوسکی، اس کا ہندی ترجمہ تو ہوا مگر وہ بھی ہندو بھائیوں تک اس مقدار میں نہ پہنچ سکا جس کی ضرورت تھی، ہم اس مضمون کو علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ایک اقتباس پر ختم کرتے ہیں جس کو آخر میں مصنف نے نقل کیا ہے:

''ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی باتیں جمع کی جاتی ہیں جن سے ہندو مسلمان کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو اور ان کا اتفاق آئندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے، حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی بھی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے ان دونوں کے درمیان اختلاط و محبت کے جذبات پیدا ہوں، مگر بازاری قدردانی کے تابع مصنف اور کتب فروش اپنی ذاتی عارضی کامیابی کے مقابلہ میں ملکی اور قومی بھلائی کی قیمت کی پرواہ نہیں کرتے''۔(ص۳۲۳)

☆☆☆

□ مذھبیات

سکھ مت ـــ ایک تعارف

مفتی تبریز عالم حلیمی قاسمی
خادم تدریس دارالعلوم حیدرآباد

مذہب کی تحقیق:

دنیا میں جہاں کہیں انسانی آبادی ہے اس کا اپنا ایک طرز معاشرت ہے جسے وہ شدت سے اختیار کئے ہوئے ہے، یہی وہ مفہوم ہے جواز روئے لغت ''مذہب'' میں شامل ہے۔مذہب اسم ظرف کا صیغہ ہے جو مصدر میمی کے طور پر استعمال ہوتا ہے،جس کے معنی ہیں چلنے کی جگہ چلنے کا راستہ وغیرہ۔اور جن اصولوں اور قوانین پر زندگی گزاری جاسکے،یہ مفہوم اس کی اصطلاحی حقیقت ہے۔اسی سے ملتا جلتا ایک لفظ (دین) بکثرت استعمال ہوتا ہے جسے مذہب کا مترادف بھی قرار دیا جاتا ہے؛چنانچہ قرآن میں ہے:ان الدین عند الله الاسلام۔(آل عمران:۹۱)۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دین اور مذہب میں ایک بڑا باریک فرق یہ ہے کہ دین نام ہے ان اصول وضوابط کا جو حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور اقدس ﷺ تک تمام انبیاء اکرام کے درمیان مشترک رہے؛ جب کہ'' مذہب'' انہی اصول کی فروع کا نام ہے؛ اس سے معلوم ہوا کہ دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے؛البتہ مذاہب تبدیل ہوتے رہے ہیں۔مذہب کے اس تناظر میں ہمیں بعض ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کا کوئی نظریہ اور مذہب نہیں ہے،انہیں ''دہریہ'' کہا جاتا ہے؛لیکن دہریہ کی یہ تعریف:''جو خدا اور پیغمبر خدا کا منکر ہو''زیادہ جامع ہے۔

مذاہب کی دو قسمیں ہیں:

مذاہب عالم کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الہامی،غیر الہامی:

الہامی سے مراد وہ ادیان ہیں جو خدا اور اس کے رسولوں اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کی طرف منسوب ہوں اور غیر الہامی مذاہب وہ ہیں جن کے ماننے والے خود کو اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ تعلیمات اور عقائد کے تابع نہیں سمجھتے،الہامی مذاہب میں یہودیت،عیسائیت اور اسلام سرفہرست ہیں، جبکہ غیر الہامی مذاہب میں،بقیہ مذاہب آتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انسان کا اصلی مذہب توحید رہا ہے،شرک اس وقت پیدا ہوا جب انسانی آبادی میں اضافہ اور پھیلاؤ ہوا اور انبیاء کی تعلیمات دھندلی پڑ گئیں؛چنانچہ آج بھی غیر الہامی اور شرک پر مبنی مذاہب: ہندومت،جین مت،بدھ مت،اور سکھ مت وغیرہ میں الہامی تعلیمات کی ہلکی پھلکی جھلک دیکھی جاسکتی

ہے۔سکھ مت بھی غیر الہامی مذاہب کا حصہ ہے، ذیل میں کچھ ضروری اور معلوماتی باتیں درج کی جاتی ہیں۔

سکھ مت کی حقیقت:

سکھ مت کے بارے میں آج کل دو نظریے پائے جاتے ہیں، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ایک جدید اور خود مختار مذہب ہے؛ جبکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ کوئی باقاعدہ مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ ہندومت کی ایک اصلاحی تحریک کا نام ہے جس نے ہندوانہ عقائد اور نظریات کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا اور اس کا نصب العین ہندوؤں کے مذہبی عقائد کی تطہیر تھا۔

(تاریخ دعوت وعزیمت: ۲۸۵/۵=، تقابل ادیان،ص:۱۰۵)

سکھ مذہب کے بانی:

سکھ مت کے حقیقی بانی کا نام ''بابا گرو نانک'' ہے، آپ ۱۴۶۹ء میں لاہور سے قریب پچاس میل جنوب مغرب میں ایک گاؤں ''تل ونڈی'' میں پیدا ہوئے تھے، یہ گاؤں اب ننکانہ کے نام سے مشہور ہے، جائے پیدائش کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ گرو جی اپنے ننہال میں پیدا ہوئے تھے، اسی نسبت سے انکا نام ''نانک'' تجویز ہوا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بچہ جو اپنے ننہال میں پیدا ہوا ہے۔آپ کے باپ کا نام بابا کلیان چند سنگھ تھا مگر وہ کالو کے نام سے زیادہ مشہور تھے، آپ کے والدین مذہبی طور پر ہندو تھے، گرو نانک جی کو مذہب اور شعر وشاعری سے بہت لگاؤ تھا، کاروباری اور عملی زندگی سے گھبراتے تھے، مجبور ہوکر والدین نے بارہ سال کی عمر میں شادی کردی جس سے ان کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے، جب اولاد کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر پڑی تو انہیں روزگار کی فکر ہوئی اور اپنے والد کی کوششوں سے سلطان پور کے نواب دولت علی خاں لودھی کے یہاں ''گھریلو ساز وسامان کے محافظ'' مقرر ہوئے اور ایک طویل عرصہ وہاں کام کیا؛ تاہم اس دوران انہیں جب بھی فرصت ملتی تو اپنے دل کو تسکین دینے کے لئے جنگلات میں جاکر مراقبہ میں مشغول ہوجاتے۔

(تقابل ادیان،ص:۱۰۶= گرونانک جی اور اسلام،ص:۱۲)

سکھ مذہب کی شروعات:

کہا جاتا ہے کہ ۱۴۹۹ء میں ایک روز نانک جی اپنے دوست ''مردانہ'' کے ساتھ ندی میں نہانے کے لئے اترے تو غوطہ لگانے کے بعد باہر نہیں نکلے، تلاش بسیار کے بعد کچھ پتہ نہیں چلا، تین دنوں کے بعد اسی جگہ سے ظاہر ہوئے جہاں دریا میں اترے تھے، لیکن کچھ دن بالکل خاموش رہے اور جب زبان کھولی تو یہ کہا: اِک اونکار ستّ نام، کرتا پرکھ، نِربھَو، نِروَیر (یعنی خدائے واحد ہی سچ ہے، وہی خالق ہے، اسے کسی کا ڈر نہیں، اس کی کسی سے دشمنی نہیں) جب ان جملوں کا مطلب پوچھا گیا تو کہا: نہ کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلمان۔ دریا میں غائب ہونے کے بارے میں بتایا کہ مجھے خدا کی بارگاہ میں لے جایا گیا تھا، وہاں مجھے امرت کا پیالہ دیا گیا اور حکم ہوا کہ نام خدا کی عقیدت کا پیالہ ہے اسے پی لو اور میرے نام کی خوشی مناؤ اور دوسروں کو اس کی تبلیغ کرو، اس واقعہ کے بعد نانک جی کو ''گرو'' بمعنی استاذ کہا جانے لگا۔ (ہندوستانی مذاہب - ایک مطالعہ،ص:۶۱)

اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ جب بابا نانک کی عمر تیس سال کے قریب پہنچی تو سکھوں کی روایات کے مطابق انہیں اللہ کا دیدار نصیب ہوا اور انہیں پیغمبر کے طور پر منتخب کرلیا

گیا اور انہیں ''کوئی مسلمان ہے نہ کوئی ہندو'' کا پیغام دیا گیا؛ اس کے بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔اس کے بعد بابا نانک نے اسلام اور ہندومت کے درمیان اتحاد کی تبلیغ کرتے ہوئے مستقل اسفار شروع کئے اور اپنے ساتھی مردانہ کے ساتھ اس نئی تعلیم کے مبلغ بن گئے،اپنی تعلیم پر زور دینے کے لئے نانک جی نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی پوشاک پہنی اور اپنے عقائد کے پرچار میں لگ گئے اور اس طرح سے سکھ مذہب کا آغاز ہوا،نانک کے ابتدائی دور میں انکے پیروکار کو بھائی کہا جاتا تھا جو غالبا پانچویں گرو کے دور میں ''سکھ'' کے نام سے متعارف ہوئے،سکھ پنجابی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مقلد کے ہیں۔

(مذاہب عالم کا انسائکلو پیڈیا،ص:۲۵۳)

سکھ مت کا تاریخی ارتقاء :

گرو نانک ۱۵۳۹ء کو کرتا پور پاکستان میں فوت ہوئے،اب وہاں ایک گردوارہ بنا ہوا ہے،یہ بات سکھوں کے یہاں مشہور ہے کہ بابا گرو نانک کی لاش چادر کے نیچے سے غائب ہو چکی تھی اور اس جگہ مقامی لوگوں کو پھول پڑے ہوئے ملے تھے،اِس لئے نہ ان کو جلایا جاسکا اور نہ ہی دفن کیا جاسکا۔نانک جی کی وفات کے بعد اس تحریک کی قیادت انگد نامی شخص نے سنبھالی،جس نے سکھوں کا اپنا رسم الخط ''گورمکھی'' ایجاد کیا اور سکھ کی مذہبی تحریروں کو مرتب کیا،اس کے بعد کے گروؤں نے بھی نانک کی تعلیمات کی پیروی کی۔اس کے علاوہ تیسرے گرو امرداس نے سکھوں کو بائیس حلقوں میں تقسیم کیا،اور چوتھے گرو رام داس نے سکھوں کی شادی اور مرنے کی رسومات ہندو مذہب سے الگ متعین کیں اور ایک قدرتی چشمہ اکبر بادشاہ سے حاصل کر کے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس چشمہ کو بڑے تالاب کی شکل میں تبدیل کرادیا،بعد میں یہ تالاب امرتسر (چشمہ آبِ حیات) کے نام سے مشہور ہوا اور شہر کا بھی یہی نام پڑ گیا۔

پانچویں گرو ارجن دیو سنگھ (۱۵۶۳-۱۶۰۶ء) کے آنے پر گرو کے عہدے اور مذہب میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں،اس نے سکھ مت کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب تیار کی،اسی کے دور میں سکھوں میں امن پسندی کے بجائے جارحیت کا رجحان پیدا ہوا،جس کے نتیجہ میں جہانگیر بادشاہ سے ٹکراؤ ہوا اور جہاں گیر کے حکم سے اسے قتل کردیا گیا،اس کے بعد اس کا بیٹا ہر گوبند (۱۵۹۶-۱۶۴۵ء) چھٹا گرو منتخب ہوا جس نے حفاظتی پہرے کے لئے خود کو مسلح کیا جس کی وجہ سے سکھوں میں دشمنوں کے لئے انتقامی جذبات میں اور اضافہ ہوا،نویں گرو تیغ بہادر تھے،اورنگ زیبؒ نے جب اس پر اسلام پیش کیا اور اس نے انکار کردیا تو اورنگ زیبؒ نے اس کو قتل کرادیا، جس کے بعد اس کا بیٹا گرو گوبند سنگھ (۱۶۶۶-۱۷۰۸ء) آخری گرو کے طور پر منتخب ہوا،چوں کہ اس کے باپ کو قتل کیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ اور اس کے ماننے والے مغل حکومت کے سخت مخالف ہو گئے اور اس نے سکھوں کو جنگ کے لئے زیادہ منظّم کیا،جس کے لئے اس نے سخت ترین امتحان کے بعد سب سے پہلے پانچ سکھوں کو جو مختلف ذاتوں کے تھے ایک مخصوص رسم کے ذریعہ مریدین کے حلقہ میں داخل کیا جو خالصہ کہلائے ،اس کے بعد ہزاروں سکھ اس میں داخل ہوئے،گرو گوبند نے اس کے لئے کچھ مخصوص قوانین بھی بنائے اور مردوں کے لئے اپنے نام میں سنگھ (شیر) اور عورتوں کو اپنے نام میں کور

(شہزادی) کا استعمال اور پانچ چیزوں کا جو ''ک'' سے شروع ہوتی ہیں رکھنا ضروری قرار دیا یعنی ''کیس'' (بال) کنگھا، کڑا، کچھ (جھانگیہ) اور کرپان (تلوار)۔ خالصہ کی تشکیل کے بعد ہی گرو گوبند سنگھ نے مغل سلطنت سے لڑنے کے لئے فوجی کاروائیاں شروع کر دیں، گرو گوبند نے اپنی موت سے پہلے یہ طے کر دیا تھا کہ اب آئندہ کوئی آدمی سکھوں کا گرو منتخب نہیں ہوگا، بلکہ ان کی کتاب گرنتھ صاحب ہی ان کے لئے ہمیشہ گرو کا کام دے گی، اس لئے اب گرو کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ (ہندوستانی مذاہب، ص: ٦٦ --مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا، ص: ۲۵۷)

جدید سکھ مت :

اگرچہ دنیا کے اکثر حصوں میں سکھ برادریاں موجود ہیں؛ البتہ جدید سکھ زیادہ تر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، اب سکھوں کے مختلف فرقے ہیں، چونکہ اس مذہب کی اولین بانیوں کی تعلیم میں ''عدم تشدد اور امن پسندی'' کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، اس کی وجہ سے موجودہ سکھ برادری میں زیادہ تر لوگ سادگی کی طرف مائل ہیں۔ کچھ مشہور فرقوں کے نام یہ ہیں :

(۱) نانک پنتھی (یہ لوگ امن پسند ہوتے ہیں اور لمبے بال رکھنے پر اصرار نہیں کرتے اور ڈاڑھی منڈوانے کو ترجیح دیتے ہیں)

(۲) اداسی (یہ لوگ رہبانیت پسند ہوتے ہیں، اداسی کے معنی ہیں: تارکِ دنیا)

(۳) اکالی فرقہ (اکالی کے معنی ہیں ''اللہ'' یعنی خدا کی پوجا کرنے والا فرقہ، یہ لوگ انتہائی جنگجو ہوتے ہیں)

(۴) سنگھ (اس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے)

نوٹ: اب عام طور سے سکھ وہ ہیں جو اپنے کو دس گروؤں کے شاگرد مانتے ہیں اور ان کے ملفوظات اور تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں۔

سکھوں کے گردوارے :

سکھوں کے گردوارے پنجاب کے اکثر علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں زیادہ مشہور گردوارے : امرتسر، گورداس پور اور فیروز پور کے اضلاع میں ہیں، سکھوں کے نزدیک سب سے زیادہ مقدس گردوارہ امرتسر کا طلائی مندر یعنی دربار صاحب ہے اور گرو نانک کی جائے پیدائش ننکانہ صاحب ہے، جہاں ہر سال مقررہ اوقات پر میلے لگتے ہیں، ہر سکھ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کم از کم ایک مرتبہ وہ'' امرتسر کے گردوارے میں حاضر ہوجائے، آج کل اسے گولڈن ٹیمپل کہا جاتا ہے۔ (تقابل ادیان، ص: ۱۱۳)

سکھوں کی مذہبی کتاب :

سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ ہے جسے سکھوں کے پانچویں گرو ارجن سنگھ نے لکھا تھا، گرنتھ کے کل اشعار کی تعداد ۳۳۸۴ ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب حضرت ابراہیم فرید چشتی کی شاعری سے لبریز ہے اور بعض کا خیال ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکر کا کلام ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے ہر شعر کے اخیر میں ''فرید'' تخلص موجود ہے۔

سکھ مت کی تعلیمات :

سکھ مت کی تعلیمات میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ ''اخوت اور مساوات کا پرچار،، ہے؛ چنانچہ گرو نانک نے یہی نعرہ دیا تھا کہ ''کوئی مسلم ہے نہ کوئی ہندو ہے،، سکھ مذہب کا رجحان اس جانب بھی ہے کہ ہندومت اور اسلام دونوں افراط اور تفریط کا شکار ہیں،

گرونانک کی تعلیمات میں، توحید، عشق الٰہی ، تزکیہ نفس ، خدمت خلق ، ارکان اسلام ، رسالت ، قرآن کریم اور قیامت اور اسلامی تصورات کے ساتھ ساتھ آواگون اور گرو جیسے ہندوانہ تصورات بھی پائے جاتے ہیں ؛ چونکہ گرونانک کی تعلیمات میں اسلام کے عقائد واحکام کا تصور بھی ہے جس کی بناء پر بعض لوگ انہیں مسلمان مانتے تھے، اور ہندوانہ تصور کی وجہ سے انہیں ہندو بھی کہا جاتا ہے۔

کیا سکھوں کو مسلمان مانا جاسکتا ہے؟

موجودہ سکھ مت اور اسلام کا تقابل کیا جائے تو یہ حقیقت خوب واضح ہوجاتی ہے کہ سکھ مسلمان نہیں ہیں، اور خود بھی اپنے کو مسلمان نہیں سمجھتے اور نہ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں، شواہد کے طور پر چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) گرونانک کا اخوت مساوات کا تصور (نہ کوئی مسلم ہے نہ کوئی ہندو ہے) اسلامی نظریہ مساوات سے بالکل الگ ہے، اسلام ایک دین ہے اور کفر خواہ کسی بھی صورت اور شکل میں ہو وہ الگ دین ہے الکفر ملة واحدة، دونوں مساوات کے نام پر جمع نہیں ہوسکتے۔

(۲) تناسخ اور آواگون کا ہندوانہ عقیدہ سکھ مت نے قبول کیا ہے جبکہ یہ اسلام کے مخالف ہے۔

(۳) نبوت وپیغمبری :سکھ لوگ اپنے بانی گرونانک کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں ؛ جبکہ اسلام میں نبی ﷺ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوسکتا۔

(۴) خلاف فطرت امور :سکھ جسم کے کسی حصہ کا بال نہیں کاٹتے ہیں ؛ جبکہ اِسلام دین فطرت ہونے کی وجہ سے غیر ضروری بالوں کے تراشنے کا حکم دیتا ہے۔

(تقابل ادیان، ص:۱۱۴)

سکھوں کے شب وروز :

سکھوں کے شب وروز کے معمولات کچھ اس طرح ہیں کہ صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے غسل کرتے ہیں ، پھر مخصوص بھجن گاتے ہیں اور دعائیں پڑھی جاتی ہیں، رات میں بھی اس کا رواج ہے ۔سکھ اجتماعی عبادات کے لئے گردوارے میں جمع ہوتے ہیں جہاں عبادت کا مرکزی عنصر گرنتھ ہوتا ہے ،کیوں کہ سکھوں کا کوئی مذہبی پیشوا نہیں ہوتا ہے۔(مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا، ص:۲۵۹)

اس موضوع پر تفصیلی کتابیں :

(۱) دین اسلام گرونانک جی کی نظر میں تالیف: عبیداللہ گیلانی، کتب خانہ انجمن ترقی جامع مسجد دہلی۔

(۲) گرونانک جی اور اسلام، مفتی محمد فاروق صاحب، مکتبہ محمودیہ ہاپوڑ روڈ میرٹھ۔

(۳) ہندوستانی مذاہب ایک مطالعہ، ڈاکٹر رضی احمد کمال ، مکتبہ الحسنات دہلی۔

(۴) تاریخ پنجاب، لالہ کھنیالال جی۔

(۵) تاریخ دعوت وعزیمت جلد پانچ ،مولانا ابوالحسن علی ندویؒ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔

(۶) مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا، مصنف: لیورس مور، ترجمہ سعدیہ جواد، یاسر جواد ، نگارشات پبلیشر زلاہور۔

(۷) تقابل ادیان، مولانا پروفیسر محمد یوسف خان، بیت الاسلام انارکلی لاہور۔

(۸) سکھ مت، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

بقلم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

نام کتاب: **آخرت کی تیاری اور اس کے محرکات وذرائع**
(قرآن وحدیث کے حوالے سے)

مصنف: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

صفحات: ۹۶

مطبع: براؤن پبلیکیشنز

ملنے کا پتہ: ادارہ علوم القرآن شبلی باغ علی گڑھ

مصنف کتاب کو قرآنیات سے شغف ہے، لیکن وہ محض علمی مضامین و مقالات لکھنے پر اکتفا نہیں کرتے، ان کے سامنے ہمیشہ یہ حقیقت مجسم رہتی ہے کہ نزول قرآن کا اصل مقصد تہذیبِ نفس انسانی اور ہدایتِ بشری ہے، اسی لیے وہ قرآن کے عملی پہلو کو پیش کرنے پر توجہ دیتے ہیں، اس سلسلہ کی کئی کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں، وہ قرآن کے نظام تزکیہ واصلاح کو نہ صرف شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں بلکہ خاص بات یہ ہے کہ اس کے اثرات ان کی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں، ان ہی اثرات کی تاثیر ان کی تحریروں میں بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

قرآن مجید میں تصور آخرت کو نمایاں اور مرکزی مقام حاصل ہے، وہ جگہ جگہ آخرت کی تذکیر کرتا ہے، جابجا تصورِ آخرت کے تفصیلی بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی قانون سازی یا تشریع قرآن میں بھی آخرت کا استحضار اصل ہے، پورے قرآن کو پڑھ جایئے تو آپ دیکھیں گے کہ آیات احکام کی ابتدا میں، انتہا پر، درمیان میں اور بسا اوقات آیات کے آخری فقروں میں اسی آخرت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، آخرت کے عذاب سے بچنے، ظالم کے ظلم سے نجات پانے، دنیا کی الجھنوں سے دامن بچانے، دنیا وآخرت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی بنیاد ذلك لمن خاف مقامی و خاف وعید پر رکھی گئی ہے، اسلوب قرآنی میں تصور آخرت کے بیان سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اصول وقوانین پر دنیا کی کوئی طاقت و حکومت اس وقت تک پوری دیانت داری کے ساتھ آمادۂ عمل نہیں کرسکتی جب تک آخرت کا استحضار اور رب العزت کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو، اس اعتبار سے ایک مسلمان کی زندگی میں تصور آخرت اصل محور قرار پاتا ہے جس کے اردگرد اس کی پوری زندگی چکر کاٹتی ہے، یہ تصور جس کے یہاں جس قدر صاف ومستحضر ہوگا وہ اسی قدر کامل درجہ کا مومن ہوگا، ظاہر ہے کہ جب آخرت ہی اصل محورِ زندگی اور مرکزی اہمیت کی حامل ہے تو اس کی تیاری پر توجہ دینا، اس کے اہمیت کو واضح کرنا اور اس کی تیاری کے لیے ممکن وسائل کو پیش کرنا ایک قابل قدر کام ہے۔

مصنف محترم نے اس اہم پہلو کو موضوع بنایا ہے، آخرت کی تیاری کے محرکات و ذرائع کو قرآن و حدیث سے تلاش کرکے یکجا کیا ہے، قرآنیات سے متعلق ان کی تحریروں میں قرآن کی ہیبت، اس کا جلال اور اس کی تاثیر صاف نظر آتی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ آیات کی تشریح میں کثرت سے احادیث نبویہ سے رجوع کرتے ہیں، انھوں نے اس کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے، باب اول میں ''قرآن کریم کی صفت تذکیر'' پر مدلل گفتگو کی ہے، دوسرے باب میں حدیث رسول سے مستفاد عنوان قائم کیا ہے ''آخرت کی تیاری اصل عقلمندی'' اور پھر اس حقیقت پر روشنی ڈالنے والی آیات کی مؤثر و واضح

تشریح کی ہے، تیسرے باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ''موت کی یاد میں عبرت ونصیحت'' ہے، باب چہارم میں اس پہلو سے گفتگو کی ہے کہ ''قبروں کی زیارت آخرت کی پہلی منزل یاد دلاتی'' ہے، پانچویں باب میں ایک اہم اور خود دیندار طبقہ میں متروک وغیر معمول بہ پہلو پر آیات قرآنیہ کی روشنی میں بہت مؤثر گفتگو کی ہے، اس باب کا عنوان ہے ''اعمال کا محاسبہ اصلاح احوال کا مؤثر ذریعہ''، چھٹے باب میں ''اللہ رب العزت کے حضور حاضری پر ایمان ویقین کے اثرات'' کو واضح کیا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس پر قرآن کریم نے جا بجا مختلف الفاظ واسلوب اور تعبیرات کے ذریعہ روشنی ڈالی ہے، ساتویں باب میں ''حسنِ خاتمہ کی اہمیت وفضیلت'' پر گفتگو کی ہے، کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں ''آخرت میں کامیابی کے لیے قرآنی دعائیں'' جمع کردی گئی ہیں۔

یہ کتاب نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی مطالعہ کے لیے بڑی مفید ہے، کتاب کے ان ابواب کو درس قرآن کے حلقوں، جمعہ کے اجتماعات اور گھر کی مجلسوں میں پڑھ کر سنایا جاسکتا ہے، ایسی کتابیں دو چند اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جن میں عملی زندگی کی اصلاح اور اصلاح احوال ومعاشرت کے لیے مصفی ومنقح مواد پیش کیا گیا ہو، جو خالص قرآنی آیات اور صحیح احادیث پر مشتمل ہو، اس ناحیہ سے یہ کتاب بڑی خصوصیت کی حامل ہے، امید ہے کہ کتابِ تذکیر تک پہنچنے کے لیے اس تذکیری کتاب سے استفادہ کیا جائے گا اور اصلاحِ احوال کے لیے تصورِ آخرت کو اپنی زندگیوں میں جاگزیں کرنے کے لیے یہ کتاب مؤثر ذریعہ ثابت ہوگی، وما ذٰلك على الله بعزيز۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

بقلم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

نام کتاب: عظمت واعجاز قرآنی کے عجیب وغریب پہلو
مصنف: پروفیسر سید مسعود احمد
قیمت: برائے مفت تقسیم
صفحات: ۱۹۲
ملنے کا پتہ: یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ

زیر نظر کتاب مصنف محترم کے متعدد مقالات و خطبات کا مجموعہ ہے جن کو تنقیح کے بعد یکجا کیا گیا ہے، بعض مقالات محض اس کتاب کی خاطر تیار کیے گئے ہیں، قرآن مجید سے مصنف کا تعلق شعوری ہے، اور شعوری تعلق یقیناً کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر وتقریر بلکہ زندگی کا محور قرآن مجید ہے۔

اس کتاب کو ۶/ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے باب میں قرآن کے نعمت الٰہی ہونے پر عقلی وقرآنی دلائل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، اس میں کیا شبہ کہ قرآن مجید تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا اور زندۂ جاوید معجزہ ہے، اس پہلو سے علمی ذخیرہ بھرا پڑا ہے، یہاں پروفیسر موصوف نے اپنے مطالعہ کا نچوڑ سادہ اور تفہیمی اسلوب میں پیش کیا ہے۔

اعجاز قرآنی ایک ایسا موضوع ہے جس پر پہلی صدی سے ہی گفتگو ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی، متقدمین میں بڑے بڑے علمائے بلاغت اور اہل زبان و ماہرین لغت

نیز علوم تفسیر کے غواص اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے ہیں، کسی نے قرآن کے لفظی اعجاز کو موضوع بنایا ہے، کسی نے معنوی اعتبار سے گفتگو کی ہے، کسی نے ترتیب ونظم کے اعجاز پر توجہ کی ہے، کسی نے اسلوب کے اعجاز کو بیان کیا ہے، کسی نے احکام کے اعجاز پر گفتگو کی ہے، اعجاز قرآنی کے میدان میں عقل واجتہاد کے لیے بڑی گنجائش ہے، جس دور میں جس پہلو کا زور ہوا ہے اسی پہلو سے لوگوں نے قرآن کے اعجاز کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہی سبب ہے کہ اس موضوع کو بڑی وسعت حاصل ہوئی ہے، عربی زبان میں اس موضوع پر متقدمین سے لے کر متاخرین تک بڑی تعداد میں علماء نے طبع آزمائی کی ہے، اسی لیے اس موضوع پر ایک پورا کتب خانہ وجود میں آ گیا ہے، اردو میں اس ضمن میں خال خال کوششیں ہوئی ہیں، باقاعدہ تصنیفی کوششیں ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مرحوم نے کی تھیں، جن کی دو کتابیں اس موضوع سے متعلق شائع ہوئیں، زیر نظر کتاب کے باب دوم میں ''قرآن مجید کے معنوی اعجاز ظروف قرآن کی روشنی میں'' سے بحث کی گئی ہے، قرآن کلام الٰہی ہے، سب سے افضل فرشتہ کے ذریعہ سب سے افضل واشرف واکرم انسان کے قلب اطہر پر اسے اتارا گیا، سب سے افضل اور فصیح وبلیغ زبان میں اتارا گیا، سب سے افضل مقام کا انتخاب کیا گیا، ان حقائق کی توضیح وتشریح کے لیے مصنف نے دلائل کے انبار لگادیے ہیں، سادہ مگر مدلل انداز میں نہ صرف ان ظروف کی فضیلت کو ثابت کیا ہے بلکہ خالی الذہن قاری کے ذہن میں بٹھانے کا سامان کیا ہے اور اس طرح اس پہلو سے اعجاز قرآنی کو ثابت کیا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب ''قرآن مجید کا ادبی حسن و اعجاز سورہ یوسف کی روشنی میں'' ہے، چوتھا باب ''قرآن حکیم کا علمی و سائنسی اعجاز'' ہے، پانچویں باب میں ''قرآن کی عظمت و یکتائی میں اعجاز'' پر گفتگو کی گئی ہے اور چھٹے باب میں ''تعلیمات قرآنی کے اعجازی پہلو'' کو پیش کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس دور میں جس علم وفن کا عروج ہوگا اسی اعتبار سے قرآن مجید کے اعجاز کو پیش کرنا پڑے گا، اس عہد سائنس میں ہمارے ایمان کے لیے تو بس یہ کافی ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے مگر سائنس کے بندوں کے سامنے قرآن کے علمی اعجاز کو پیش کرنا ضروری ہے، اس پہلو پر گفتگو اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسان کو اللہ نے زمین کا خلیفہ بنایا ہے، کائنات کی تمام اشیا کو اس کے لیے پیدا کیا ہے خلق لکم ما فی الارض جمیعا، (بقرہ ۲۹) خلافت ارضی کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تسخیر کائنات پر توجہ مرکوز کی جائے، شریعت اور آیات کونیہ کے درمیان توازن قائم کیا جائے، قرآن مجید میں ''آیت'' کا لفظ معجزہ کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے، قرآنی آیت کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور آفاق وانفس کی نشانیوں یا آیات کونیہ کے لیے بھی مستعمل ہے، آیات کونیہ میں غور وتدبر سے تسخیر علوم اور اسلامائزیشن آف نالج کی راہیں کھلتی ہیں اور خلافت ارضی کا حق ادا کرنے کے وسائل فراہم ہوتے ہیں، جبکہ آیات قرآنیہ میں غور وتدبر سے ان وسائل کے استعمال

اورانسانیت کے لیے ان کو نفع رساں بنانے نیز وسائل کی موجودگی میں بھی اللہ پر اعتماد اور آخرت کی تیاری کا سبق یاد ہوتا ہے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ امت مسلمہ کے تخلف اور اس کے انحطاط کی بڑی وجہ آیات کونیہ اور آیات قرآنیہ میں غور و تدبر کے درمیان عدم توازن ہے، تدبر قرآن پر پہلی صدی سے آج تک مسلسل کتابیں تصنیف کی جارہی ہیں جبکہ آیات کونیہ میں غور و تدبر کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے، وہ ان میں غور و تدبر کرتے ہیں، ان کے اعجاز علمی کا اعتراف کرتے ہیں، قرآن مجید کے علمی وسائنسی اعجاز پر گفتگو بھی جس قدر غیروں نے کی ہے اور جتنے ٹھوس دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے وہ بھی ہمارے حصے میں نہیں آئی، عربی میں اس پہلو پر شیخ عبدالمجید زندانی نے بڑا کام کیا ہے، ان کا نام نامی اس پہلو سے بہت نمایاں ہے، اردو میں علامہ شہاب الدین ندویؒ کی خدمات جلیلہ طلبۂ قرآن کی طرف سے شکریہ کی مستحق ہیں مگر صد افسوس کہ اس پہلو سے ان کی کوششوں کا اعتراف نہ اس طرح اپنوں نے کیا جس کا استحقاق تھا اور نہ ان لوگوں نے کیا جنھیں شغفِ قرآن کا دعویٰ یا قرآنیات سے مضبوط تعلق پر فخر ہے، وقت کے بڑے علماء نے انھیں علم کلام جدید کا بانی، متکلم اسلام اور غزالی زماں قرار دیا مگر یہ سب صرف وقتی لفاظی سے زیادہ کچھ نہیں، عملاً ان کی تحقیقات کو لوگوں نے آگے بڑھانے میں تأمل کیا، جو شخص زندگی بھر سائنس پر قرآن کی بالادستی ثابت کرنے میں کوشاں رہا، اسی کی تحقیقات لوگ محض اس خدشہ سے دباتے رہے کہ کہیں وہ سائنس کی بالادستی کو نہ ثابت کرنے لگے، جبکہ جمود و تعطل کے ماروں نے جو سلوک کیا وہ جو داستانِ عبرت ہے، اس کتاب کے اس باب میں بھی ان ہی علمی حقائق کو پیش کیا گیا ہے، قرآن و وسائنس کے فرق کو واضح کرتے ہوئے اس کے سائنسی اعجاز بالخصوص آیات کونیہ کے اعجاز پر مدلل گفتگو کی گئی ہے اور قرآن مجید کے سائنسی اعجاز کو پیش کرنے کی مختصر مگر واضح و جامع کوشش کی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ زیر نظر کتاب مصنف کے قرآنی ذوق کی غماز ہے، قرآن سے شعور و تعلق کا نتیجہ ہے، قرآن سے عشق سطر سطر سے ظاہر ہے، مجموعی طور پر عظمت قرآن کے آگے سجدہ ریز قلم نے بالارادہ علمی انداز سے لوگوں کے دلوں میں قرآن کی کردینے کی کامیاب کوشش کی ہے، کتاب بہر لحاظ قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہے، چونکہ اس موضوع میں بڑی وسعت و ہمہ گیریت ہے، عقل و اجتہاد کے لیے بڑی گنجائش ہے اس لیے ممکن ہے کہ کسی بات سے کسی کو اختلاف ہو مگر اس علمی اختلاف کے سبب اس بات کی اہمیت نہیں کم ہوتی، کتاب اپنے مصنف کی طرح سادہ مگر باوزن و پرکار ہے، کتاب کے اسلوب میں مصنف کی شرافتِ نفسی و انکساری اور علمیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے، قرآنیات اور بالخصوص اعجاز قرآنی کے موضوع پر اس کتاب کو ایک عمدہ اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

❑ شعر و ادب

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی!

علامہ اقبالؒ

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی!
دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی!
متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟
وہی دیرینہ بیماری! وہی نا محکمی دل کی!
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!
حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!
نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراںؔ، وہی تبریز ہے ساقی!
نہیں ہے نااُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!
فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی!

☆☆☆